ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آپ کے بال بھی کھڑے ہو سکتے ہیں!!

تفصیل اندر ملاحظہ کیجئے۔

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"
بالکل ایسے ہی
گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احساس
کا
ایک حسین نام
نورس
قومی مشروب
اب عوامی پیک میں بھی دستیاب ہے
نورس
Naurus
Naurus (Pvt) Limited

مُدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مُدیرِ مسئول
تجمّل حسین چشتی
مشاورت
مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجدؔ
مُدیرانِ اعزازی
طاہر مسعود
محمد سلیم مُغل
مجلسِ اِدارت
شاہنواز فاروقی، سیّد خورشید عالم
خطاطی
عارف سعید

جلد (۳)
شمارہ (۲)
اگست ۱۹۸۸ء
ذی الحج ۱۴۰۸ھ
قیمت ۶/ روپے
زرِ سالانہ کیلئے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیئے

ماھنامہ
آنکھ مچولی میں
شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق
بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی
اجازت کے بغیر کوئی تحریر
شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارہ اِشاعت برائے
تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماھنامہ
آنکھ مچولی
میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث
پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و
واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ
مماثلت کی صورت میں
ادارہ ذمہ دار
نہ ہوگا۔

گرین
گائیڈ اکیڈمی
برائے خط و کتابت و مقامِ اِشاعت ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

ناشر
ظفر محمود شیخ
طابع ـ زاہد علی ، مطبع ـ لاریب
پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

ایک بار کی زحمت

سال بھر کا آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

صرف ایک بار زحمت کیجیے اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیے۔

آنکھ مچولی کے (۱۲) شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ (۱۲۶) روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بہ یک وقت آپ دو فائدے اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) **۳۶** روپے کی خصوصی بچت۔

(۲) گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ

رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو ۹۰ روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

(۱) خریدار کا نام (۲) مکمل پتہ (۳) رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے (۴) فون نمبر (اگر ہو) (۵) دستخط

"خصوصی بچت اسکیم" ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی-۱۱۲- نورس روڈ سائٹ کراچی ۱۶

حسنِ ترتیب

اداریہ ۵
نشانِ عظمت ۷
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک ۱۰
اس ماہ کا نام کیسے پڑا؟ — محمد اسلم شیخوپوری ۱۱
جودلوں کو فتح کرنے — پروفیسر عنایت علی خان ۱۲
بکر پارے (نظم) — شاہنواز فاروقی ۱۵
ارشد کی سائیکل — اسما ہارون ۱۷
سفرنامہ ترکی: آؤ گھومیں دنیا — عبیداللہ کیہر ۱۹
آزادیوں کے سائے (نظم) — صباحت شکیل ۲۳
کھویا ہوا چہرہ — ابنِ شہباز خان ۲۵
کیا آپ ذہین ہیں؟ — اُمِ رُباب جعفری ۳۰
جنابِ صدر دو آنسو ہمارے لیے بھی! — طاہر مسعود ۳۱
ہم سا ہو تو سامنے آئے! — ادارہ ۳۵
دریائی گھوڑا — ادارہ ۳۷
آہستہ بولیے ابو دوپٹے سن رہے ہیں — شین فاروقی ۳۸
دھماکہ (سلسلے وار ناول) — اظہر نیاز ۴۲
سائنس اِنکوائری — نیرّ ابدالی ۴۹
سچّی خوشی — محمد سلیم مُغل ۵۳
ہو گئی بات صاف (نظم) — احمد حاطب صدّیقی ۶۱
کھٹے میٹھے (منتخب لطائف) ۶۲
گپنو میاں — سلیم الطبع ۶۶
آپکے بال بھی کھڑے ہو سکتے ہیں — عائشہ سلیم ۷۰
حق اسکواڈ (مشکوٰۃ ویڈیو سیریز) — اخلاق احمد ۷۲
گنی چُنی معلومات — عقیل عباس جعفری ۸۰
انسانوں سے پیار کرو (نظم) — محمد جاوید خالد ۸۳
غاروں سے چوباروں تک — سیّد خورشید عالم ۸۵
تلاش (سلسلہ وار ناول) — ترجمہ۔ آصف فرخی ۸۷
سوال در سوال (دلچسپ مقابلۂ معلومات) — اُسامہ بن سلیم ۹۵
ٹیٹو کی برساتی — ترجمہ۔ سیّد عبدالحفیظ عزمی ۹۹
نئی تحریریں ۱۰۵
آؤ ملائیں ہاتھ (قلمی دوستی) ۱۱۵
امّی ابّو کا صفحہ — شانی ایوب ۱۱۸

نشانِ عظمت

گلہری کی دُم پتھر کے نیچے پھنسی ہوئی تھی ... اور وہ چُوں چُوں کرکے گزرنے والوں کو اپنی تکلیف کا احساس دِلا رہی تھی کہ معاً کوئی آئے اور اُسے اس پریشانی سے نجات دِلا دے ...

اُس راہ سے گزرنے والے ایک بچّے نے جب گلہری کو اِس مشکل میں گرفتار دیکھا تو آگے بڑھ کر پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی ... مگر پوری کوشش کے باوجود نہ تو وہ بھاری پتھر اپنی جگہ سے ہٹا اور نہ ہی گلہری آزاد ہوئی ... بچّے کے ذہن میں کوئی ترکیب آئی اور وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنے گھر کی جانب لپکا جو بالکل قریب تھا ... بچّہ گھر سے لوہے کی ایک سلاخ لے کر آیا اور اُس کی مدد سے بہ آسانی پتھر کو ایک جانب لُڑھکا دیا ... گلہری آزاد ہوگئی اور خوشی سے پھدکتی ہوئی جنگل میں کہیں غائب ہوگئی۔ اپنی ذہانت سے ننھی گلہری کو آزادی دِلا کر بچّہ بے حد خوش ہُوا اور مسرت سے اُس کا چہرہ جگمگانے لگا۔

یہ بچّہ بڑا ہو کر غلاموں کا نجات دہندہ اور جمہوریت کا بانی کہلایا ... اس عظیم شخصیت کو پوری دنیا امریکہ کے صدر ابراھام لنکن کے نام سے جانتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگست آزادی کا مہینہ ہے۔ اس مبارک مہینے میں ہمارا ملک قائم ہوا تھا۔ یہ آزادی ہمیں نہ تحفے میں ملی تھی اور نہ بھیک میں۔ اسے ہم نے ایک طویل جدّوجہد اور بھاری قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزادی کی قدر و قیمت کا احساس ہمارے دل سے کم ہوتا گیا۔ آزادی ایک نعمت ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانا بے حد ضروری ہے۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ آزادی کے بعد ہم نے زندگی کے کئی شعبوں میں بہت ترقّی کی لیکن بہت سے میدان ایسے ہیں جہاں ہم ترقّی کرنے کے بجائے تنزّل کا شکار ہوئے۔ آج ہمارے چاروں طرف مسائل ہیں۔ جرائم کا مسئلہ امن و امان کا مسئلہ، غربت و افلاس کا مسئلہ۔ تعلیم کو عام کرنے کا مسئلہ، اور اسی طرح کے بہت سے مسائل۔ یوں تو مسائل کہاں نہیں ہوتے۔ مسائل اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندہ قومیں مسائل سے گھبراتی یا پریشان نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان سے نبرد آزما ہوتی ہیں، ان پر قابو پاتی ہیں۔ پاکستانی قوم بھی ایک زندہ قوم ہے۔ اس میں ترقی کرنے، آگے بڑھنے اور مشکلات پر قابو پانے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بحیثیت قوم ہمارا بنیادی مسئلہ ایک ولولہ انگیز مخلص اور دیانتدار قیادت کا ہے۔ اگر ہمیں اچھے اور سچّے قائد مِل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان مسائل کو حل نہ کر لیں جو ہمیں درپیش ہیں۔ آزادی کے بعد آج تک ہمیں جتنے مصائب اُٹھانے پڑے ہیں ان سب کا بنیادی سبب قیادت کا بحران ہے۔ کیوں کہ قیادت کی محرومی ہی نے بیشتر مسائل کو جنم دیا ہے۔

قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے کٹھن مراحل بھی آتے ہیں۔ اس راہِ پُرخار میں تھک کر بیٹھ جانے والی قوموں کے نصیب میں ذلّت و رسوائی لکھ دی جاتی ہے اور وہ قومیں جو مضبوط اعصاب کے ساتھ جدّوجہد کی راہ پر گامزن رہتی ہیں، حقیقی آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔

۱۴ اگست کا دن آج بھی ہماری قومی زندگی میں ایک تہوار کی حیثیت رکھتا ہے، عمارتوں پر پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ گلی کوچوں کو جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے، چراغاں کیا جاتا ہے، قومی نغمات سے فضائیں گونج اُٹھتی ہیں۔ ان رسومات کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلّمہ ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہمارے سیاستدان، علماء، متموّل طبقے، ماہرینِ معاشیات، معلّمین بلکہ ہر شخص یہ سوچے کہ اس ملک کے لیے وہ اپنی ذمّے داریاں کہاں تک ادا کر رہا ہے۔ آزادی کی حقیقی قدر و قیمت اور حفاظت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب ہم اپنے فرائض کو پہچانیں، بحیثیت مسلمان اور بحیثیت پاکستانی پُرانی نسل جس نے آزادی حاصل کی اس کی ذمّے داریاں ختم ہوئیں، اب ذمّے داریوں کا بوجھ نسلِ نو کے کاندھوں پر ہے۔ اسے اپنی اور قوم کی تقدیر بنانی ہے۔ ہمیں خدا کی ذات اور نسلِ نو کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی حقیقی قیادت اسی نسل میں سے اُٹھے گی اور ثابت کرے گی کہ ہم واقعی آزادی کے مستحق تھے۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

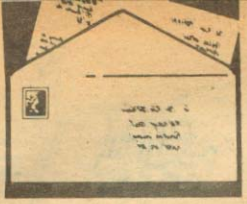

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

حامد علی شاہد، لاہور ۔ بے شک موسمِ خزاں میں بھی بہار کی امید رکھنی چاہیئے۔ خط کا جواب حاضر ہے۔ آپ کی یہ شکایت درست نہیں ہے، کہ ہم خصوصی شمارہ اچانک چھاپ دیتے ہیں، 'کرکٹ اسپیشل'، 'قہقہہ نمبر' اور 'سالگرہ نمبر' ان سارے شماروں کا اعلان پہلے ہی کیا جاچکا تھا اور اگر آپ کے الزام کو درست بھی مان لیا جائے تو کیا یہ درست نہیں ہے کہ اچانک ملنے والے تحفے کی خوشی سب سے زیادہ ہوتی ہے؟ مطمئن رہیئے "قہقہہ نمبر۲" کا اعلان آپ کی توقع سے پہلے کیا جائے گا۔

گل شیر علی سنی، پشاور ۔ گل شیر میاں! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں بہت غصہ آیا، کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ "ڈاک ڈاک بالکل بور تھا" لیکن جب آگے پڑھا تو غصہ جاتا رہا۔ "کیونکہ اس میں میرا خط جو نہیں تھا۔" آپ ہر شمارے پر، بڑے شوق سے "شوخ سا" تبصرہ تحریر فرمایئے اور بے خوف ہو کر۔ ہمارا غصہ یونہی بس دکھاوے کا ہوتا ہے۔

مسمیرالاشتیاق، ملیر کالونی، کراچی۔ رسالے کی قیمت ہم نے دل پر جبر کر کے بڑھائی ہے۔ یقین مانیے اگر کاغذ مہنگا نہ ہوتا اور دیگر مسائل آڑے نہ آتے تو ہم قیمت کبھی نہیں بڑھاتے۔ ایک خوبصورت اور معیاری رسالے کے لیے ذرا سا بوجھ برداشت کر لیجیے۔ آپ کی تحریروں کا فیصلہ باری آنے پر کر دیا جائے گا۔

جے آئی ساحر، بلدیہ ٹاؤن، کراچی ۔ 'سالگرہ نمبر' میں اپنا نام نہ دیکھ کر آپ کو افسوس ہُوا۔ آپ کے اس افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ بہرکیف، پھر بھی "ایلس اِن ونڈرلینڈ" اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسے آنکھ مچولی میں سلسلہ وار شائع کرنے کی تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

نائلہ بختیار، کوہاٹ ۔ اگر آنکھ مچولی میں آپ کی تحریر کبھی شائع نہیں ہوئی تو پھر شکایت تو ہمیں آپ سے ہونی چاہیئے کہ آپ نے ہمیں کوئی اچھی تحریر کیوں نہ بھیجی۔ حوصلہ افزائی بھی تو اچھی ہی تحریروں پر ہوتی ہے نا۔ خوب محنت کیجئے اور کوئی شاندار تحریر ہمیں بھیجیے۔ حوصلہ افزائی بھی انہی کی ہوتی ہے جو حوصلہ نہیں ہارتے۔ 'سالگرہ نمبر' کے کارڈوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔

غلام نبی ۔ لانڈھی، کراچی۔ 'سوال در سوال' کے متعلق آپ نے کیا پوچھنا چاہا ہے، بہت غور کرنے پر اور آپ کا خط بار بار پڑھنے پر بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور جب 'سوال در سوال' کے سلسلے میں سوال ہی سمجھ میں نہ آئے تو جواب کیا دیا جا سکتا ہے؟ 'حق اسکواڈ' اپنے کارناموں کے ساتھ اس شمارے میں حاضر ہے۔

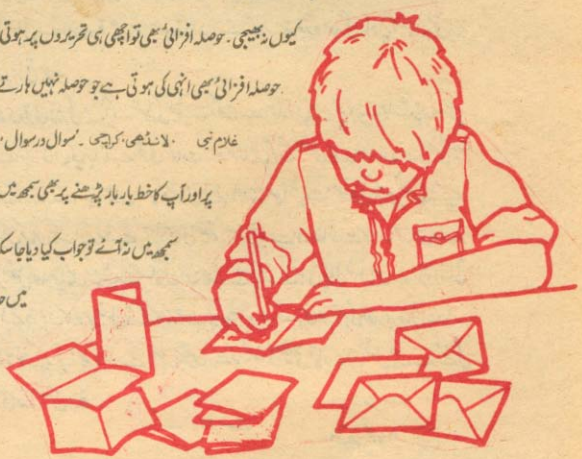

شازیہ گل، سرگودھا ۔ 'سالگرہ نمبر' کی مبارک باد کا شکریہ۔ آپ نے درست لکھا ہے

کہ قیمت میں اضافے سے رسالے کی چمک دمک میں بھی یقیناً اضافہ ہوگا۔ اگر آپ کی دعائیں شاملِ حال رہیں تو اس کی خوبصورتی سدا قائم رہے گی۔

شام داس کھتری، کوٹ غلام محمد۔ 'سالگرہ نمبر' اپنی چمک دمک کے ساتھ آپ کو پسند آیا لیکن ہمیں آپ کے دوستوں کا رویّہ پسند نہیں آیا جو آپ کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا تو تم اسی آنکھ مچولی کے عاشق ہو جو تمھاری کوئی تحریر نہیں چھاپتا۔ میرے عزیز شام داس! حاسدوں کے بہکاوے میں نہ آئیے۔ جس رسالے سے آپ کو محبت ہے اس کی ہر ادا سے آپ کو پیار ہونا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے نا!

سیّد اسد معروف دوست، پشاور۔ سیّد صاحب! ہمیں 'سالگرہ نمبر' کی تعریف میں سینکڑوں خطوط موصول ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بچّوں نے کہانیوں، رنگین صفحوں اور اس کے نئے اندازِ پیشکش سبھی کو پسند کیا ہے۔ پھر بھی خوب سے خوب تر کی جستجو جاری ہے۔ آپ نے رسالے کی قیمت اور معیار پر جو اعتراضات کیے ہیں بچّوں کی اکثریت کی رائے اس کے برخلاف ہے۔ پھر بھی ہم اس کے معیار کو اور بلند کرنے کی کوشش کریں گے۔ سیّد صاحب! آخری بات یہ کہ ہم تنقیدی خطوط کا ہمیشہ خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھی تنقید کرتے ہوئے شائستگی، تہذیب اور شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ اس سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ معترض کی تربیت کیسے ماحول میں ہوئی ہے۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

مقصود احمد صدیقی، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔ بھئی آپ نے اتنا تفصیلی تبصرہ 'سالگرہ نمبر' پر لکھ مارا ہے کہ آپ کے تبصرے پر مزید تبصرے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ 'سالگرہ نمبر' کے حوالے سے آپ نے پچھلے نمبروں کی بھی خوب یاد دہانی کرائی۔ بہرحال آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں۔ قابلِ عمل تجویزوں پر فوراً عمل کیا جائے گا۔ مطمئن رہیئے۔

سیّد شاہ، جنگل خیل، کوہاٹ۔ آپ کی طرح بہت سے بچّوں نے ہماری توجہ پروفیسر عنایت علی خاں کی نظم "گرمی" کی طرف مبذول کرائی ہے اور لکھا ہے کہ یہی نظم اس مہینے بچّوں کے ایک اور رسالے میں بھی شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب ہمارے بزرگ ہیں، کرم فرما ہیں، ان کی اکثر چیزیں آنکھ مچولی میں چھپتی ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ لکھنے والے کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو جس رسالے میں ارسال کرے، وہی تخلیق کسی دوسرے رسالے میں بھیجتے ہوئے کم از کم اس کی اجازت ضرور حاصل کرے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اس کی ذمہ داری رسالے پر نہیں لکھنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ فارسی کا محاورہ ہے کہ بزرگوں کی غلطی پکڑنا خود ایک غلطی ہے۔ اس لیے ہم اور کیا عرض کریں۔

محمد اعجاز خان مجاہد، مشورو، ضلع دادو۔ آپ نے کیسی پیاری بات پوچھی ہے کہ ہم اتنا پُرکشش رسالہ کیسے نکالتے ہیں؟ آپ کو کیا پتہ کہ اس کے لیے ہمیں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے، کتنا خون جلانا پڑتا ہے۔ روزانہ صبح سویرے آدھ پاؤ پستہ، بادام، کشمش کے علاوہ بھنی ہوئی مُرغی روغنی روٹی، ایک گلاس دودھ اور مختلف قسم کی دماغی ورزشیں تو خیر اپنی جگہ۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ مگر ٹھہریئے۔۔۔ محض یہ سب کچھ کرنے سے اچھا رسالہ نہیں نکل سکتا۔ اچھا رسالہ تخلیقی صلاحیت، بے پناہ محنت اور قلم کاروں اور قارئین کے تعاون کا نتیجہ ہوتا ہے۔

محمد عاصم چشتی، چیچہ وطنی۔ بھئی آپ نے خواہ مخواہ اتنے پیسے خرچ کیے! سوال در سوال، کا کوپن ہر شمارے کے ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کوپن احتیاط سے استعمال کریں گے تو کیوں خراب ہوگا۔

مظفر نقوی، شہر کا نام نہیں لکھا۔ خُدا کا شکر ہے کہ آپ نے بہت سوچ بچار کے بعد ڈھیروں پرچوں میں سے آنکھ مچولی کا مستقل ممبر بننے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ رہا سوال حوصلہ افزائی کرنے کا تو بھئی معیاری مضامین اور کہانیاں تو ہم شکریے کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور رسالے کے معیار کا اندازہ رسالہ پڑھ کر آپ لگا ہی چکے ہوں گے۔

محمد جمیل لطیف، ٹنڈو الہ یار ۔ پرانے رسائل کے لیے ۵ روپے فی رسالہ کے حساب سے منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ انشاءاللہ رسالہ بھیج دیا جائے گا۔

محمد عثمان، ماڈل ٹاؤن، لاهور ۔ بھئی جتنے خصوصی شمارے آنکھ مچولی شائع کرتا ہے۔ اس کی تو کوئی مثال ہی نہیں ملتی، ہمارا سالگرہ نمبر، جولائی میں شائع ہوتا ہے جنوری میں نہیں۔

توقیر احمد قریشی، مظفر آباد، آزاد کشمیر ۔ توقیر میاں! سالگرہ نمبر کے ساتھ چار تہنیتی کارڈوں کا سیٹ تحفے میں دیا گیا تھا۔ ٹائٹل پیج پر پڑھ لیجیے۔ اگر آپ کو صرف ایک کارڈ ملا ہے تو یہ کسی نے بد دیانتی کی ہے۔ آپ نیوز ایجنٹ سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیجیے۔

تاج الدین، مندوخیل ۔ آپ نے بڑے ارمان سے کہانی لکھی، ہم نے آپ کی کہانی غور سے پڑھی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ابھی آپ اور محنت کیجیے۔ لکھنے کی مشق کیجیے، مطالعہ کیجیے۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی لکھی ہوئی کہانی شائع نہ ہو۔

تنویر احمد، حیدرآباد ۔ شاید آپ 'آنکھ مچولی' غور سے نہیں پڑھتے، ورنہ آپ کو انتظار کی اتنی زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی۔ ہماری تمام کتابوں کا اشتہار ہر مہینے کے رسالے میں شائع ہوتا ہے۔ کتابوں کے نام اس میں آپ پڑھ سکتے ہیں۔

زاهد غنی، ظفر وال ۔ عزیز غنی! کہانی بھیجنے کے لیے پیشگی اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے شوق سے بھیجیے۔ 'سالگرہ نمبر' کی... پسندیدگی کا شکریہ۔

محمد شاهد فیروز، گوجرانوالہ ۔ انعامی سلسلے کم دیکھ کر آپ کو دُکھ ہوا۔ حالانکہ اس میں دُکھی ہونے کی بات تو نہیں تھی۔ انعامی سلسلے تو اچھے خاصے ہیں۔ ہاں اس میں اضافے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ کہانی کا مختصر خاکہ دے کر بچوں سے کہانیاں لکھوانے کی تجویز اچھی ہے۔ 'نئی تحریریں' نئے لکھنے والوں کے لیے ہے۔ بڑے مصنفوں سے لکھوانے میں کیا خرابی ہے؟ کیا صرف یہ کہ وہ بڑے ہیں؟

محمد عمران احمد، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۔ صدر ضیاء الحق کے بچپن کی تصویر کو بچوں کی بڑی تعداد نے پہچان لیا تھا۔ سارے بچوں کا نام شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ بہر حال آئندہ سہی۔ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کیا شائع کیا جائے؟ یہ آپ نے نہیں بتایا۔ پھر بھی تجویز اچھی ہے۔

ایس اے جعفری، لاهور ۔ حمد اور نعت ہم ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ عالم اسلام کی سربلندی کے لیے مسلمانوں کو نیک عمل کرنے چاہئیں۔ محض سنہرے حروف بکھیرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

شہاب الدین سانگھڑ ۔ کیا خطوط کے جواب آپ کو پسند نہیں آئے۔؟ فرض کیجیے اگر ہم صرف خطوط یا سوالات شائع کرنا شروع کر دیں۔ تو پھر ان سوالوں کا جواب بچوں کو کیسے معلوم ہوگا؟ مینا سلطانہ کی کہانی پر آپ نے چوری کا الزام لگایا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ انھیں آنکھ مچولی کی محفل سے نکال دیا جائے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ کس مہینے اور سال کے رسالے میں یہ کہانی شائع ہوئی تھی۔

محمد شاهین، بہاولنگر ۔ بھی آپ کے اصرار پر خط شامل اشاعت کیا جا رہا ہے لیکن جواب طلب بات تو کوئی ہے ہی نہیں۔ بھلا ہم کیا جواب دیں! سالگرہ نمبر کے جن جن لکھنے والوں کو آپ نے مبارک باد دی ہے، ان تک آپ کی مبارک باد پہنچا دی جائے گی۔

سعدیہ هاشمی، گجرات ۔ آپ کا نام نیا سہی لیکن جس بے تکلفی اور محبت کے ساتھ آپ نے آنکھ مچولی کو مخاطب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے سے آپ کی قلبی وابستگی بہت پرانی ہے۔ آنکھ مچولی نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ لکھنے والوں کی محفل میں آپ کا اضافہ پڑھنے والوں کو یقیناً خوشگوار محسوس ہوگا۔

محمد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

ذوالحجّہ قمری سال کا بارھواں مہینہ ہے، ذوالحجّہ کا معنیٰ ہے حج والا۔ چونکہ اس مہینے میں حج کیا جاتا ہے اس لیے اس کو ذوالحجّہ کہتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیّت میں مُشرک لوگ بھی حج کرتے تھے، لیکن انھوں نے حج کے سلسلے میں عجیب عجیب رسمیں ایجاد کر لی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صحیح طریقے سے حج کرنا سکھایا۔

نو/۹ ذوالحجّہ کو لاکھوں مسلمان میدانِ عرفات میں جمع ہو کر حج ادا کرتے ہیں اگرچہ حج کے اعمال تو متعدّد ہیں مگر اصل میں حج میدانِ عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے۔ اس کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ دس/۱۰ تاریخ کو دنیا بھر کے مسلمان عیدالاضحیٰ مناتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سُنّت زندہ کرنے کے لیے جانوروں کی قُربانی دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام، اللہ تعالیٰ کے حُکم کی تعمیل میں اپنے نیک بخت فرزند اسماعیل علیہ السلام کی قربانی دینے کے لیے تیّار ہو گئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جنّت سے دُنبہ بھیج دیا۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کے بدلے میں اُس دُنبے کو ذبح کیا گیا۔ مسلمان ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کو ذبح کر کے حضرت ابراہیمؑ کی اس سُنّت کو زندہ کرتے ہیں۔

۲۷/ ذوالحجّہ ۲۳ھ کو ابولؤلؤ فیروز مجوسی نے خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو دورانِ نماز قاتلانہ حملہ کر کے شدید زخمی کر دیا اور وہ اسی زخم کی وجہ سے یکم محرّم کو شہید ہو گئے۔

پروفیسر عنایت علی خان

جو دلوں کو فتح کرلے ...

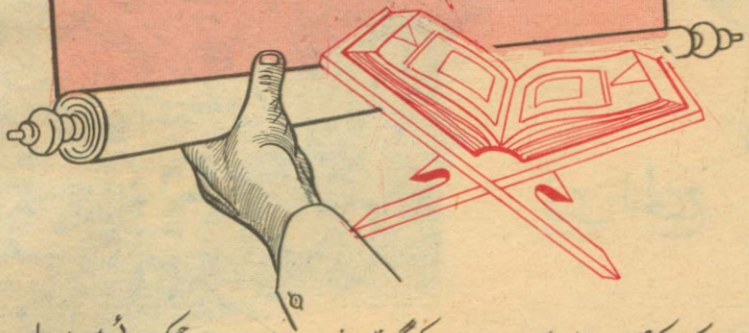

راوی، کفارِ مکہ صحنِ حرم میں کھڑے ہیں۔ ان کی گردنیں شرم و ندامت سے جھکی ہوئی ہیں اور دل خوف سے لرز رہے ہیں ہر ایک کے دل میں رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ کاش ہم نے پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا..... کاش ہم نے انہیں اذیتیں دے کر مکّے سے نہ نکالا ہوتا کاش ہم نے مدینے پر حملہ نہ کیا ہوتا! افسوس ہم نے ان کی دشمنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی!..... اب کیا ہوگا؟ اب تو مکّے پر ان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ہم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ شہر سے باہر یا شہر کے اندر کا مقابلہ کر سکتے!..... اب کیا ہوگا؟ بادشاہ تو یوں بھی جب کسی شہر کو فتح کرتے ہیں تو انتقام کے جوش میں اس کے باشندوں کا قتلِ عام کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں سے تو ہم نے سلوک بھی بہت بُرا کیا ہے وہ تو ہمارے ساتھ جو کچھ کریں کم ہے۔

"اب کیا ہوگا؟" ایک شخص کے دل کا خوف زبان پر آ گیا۔ "ہونا تو بدترین سلوک چاہیئے لیکن توقع ہے کہ محمدؐ ہمارے ساتھ کچھ رعایت برتیں گے" دوسرے نے پہلے شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کس طرح؟ کس بنا پر؟" پہلے نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ" دوسرے نے کہنا شروع کیا "جس وقت لشکرِ اسلام فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ تو ان میں سے کسی نے بجوشِ غضب میں نعرہ لگایا تھا کہ آج انتقام لینے کا دن ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں" پہلے شخص نے کہا۔

"رب کعبہ کی قسم ہم نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا اب تو وہ ہمارے ساتھ جو کریں کم ہے۔"

"پہلے پوری بات تو سنو!" دوسرا بولا۔ "لیکن ابھی اس نعرے کے الفاظ ختم بھی ہونے پائے تھے کہ ایک اور آواز ابھری "نہیں! آج انتقام کا نہیں عفو و درگزر کا دن ہے اور معلوم ہے یہ کس کی آواز تھی؟ محمدؐ کی۔

"پھر تو کچھ رعایت کی توقع کی جا سکتی ہے" پہلے شخص کو یہ بات سن کر کچھ اطمینان ہوا، "لیکن وہ پھر بھی کس کس کو معاف کریں گے؟ ہم میں تو وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ذاتی طور پر محمدؐ کو تکالیف دیں، ان کے ساتھیوں کو اذیتیں دے کر قتل کیا حد یہ ہے کہ ان کے چچا کی لاش کا سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ چبا ڈالا۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ یہ سب وحشیانہ مظالم کیسے معاف کئے جا سکتے ہیں؟" پہلے کو اب بھی اپنی معافی کا یقین نہ تھا۔

"اور تم نے وہ دوسرا اعلان نہیں سنا؟" دوسرے نے پوچھا "کون سا؟" پہلے نے کہا۔

"وہی کہ جو کوئی بیت اللہ میں آجائے گا اسے پناہ دی جائے گی اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے بھی پناہ دی جائے گی" دوسرا بولا۔

"ابوسفیان کے گھر میں بھی؟" پہلے نے تعجب سے پوچھا "وہ تو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے اس نے دو سال قبل مسلمانوں کو حج تک نہیں کرنے دیا تھا۔ ویسے ہی لوٹا دیا تھا، وہی تو تھا جو ہم سب کو مسلمانوں کی دشمنی پر ابھارا کرتا تھا۔ اُسی کے گھر کو پناہ گاہ بنا دیا گیا؟"

"ہاں اور وہ بھی پناہ میں رہے گا جو خود اپنے گھر میں بیٹھ جائے۔ صرف مقابلہ کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ بالکل یہی اعلان ہوا تھا" دوسرے نے کہا تم نے دیکھا نہیں اب تک مکے کی گلیوں میں کسی ایک شخص کا بھی خون نہیں بہا۔"

"اور اگر ہم جنگ بدر، جنگ احد یا جنگ خندق میں مدینے پر قبضہ کر لیتے تو کیا ہم بھی مسلمانوں سے ایسا ہی سلوک کرتے؟" پہلا بولا۔

"میدان جنگ میں لاشوں کا کلیجہ چبا جانے والے لوگ فاتح بن کر کیا کچھ نہ کرتے" دوسرے نے جواب دیا۔ "اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں محمدؐ سے اچھی ہی توقع رکھنی چاہیئے۔ دیکھو! محمدؐ

سب کو اپنی جانب متوجہ کر کے کچھ کہنے والے ہیں دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ سب لوگ گوش بر آواز ہیں

"تم ذرا میرے قریب ہی کھڑے رہو، میں کم سنتا ہوں جو کچھ وہ کہیں مجھے بھی بتاتے جاؤ" پہلے نے دوسرے سے درخواست کی۔ "بہت اچھا، لیکن اب تم بالکل خاموش کھڑے رہو" دوسرا بولا..... "لو سنو!"

پہلا بے تابی سے "کیا کہہ رہے ہیں؟"

کہہ رہے ہیں کہ "اے گروہ قریش! آج تم مجھ سے کس سلوک کی توقع کرتے ہو؟ خود ہمیں سے پوچھ رہے ہیں" دوسرے نے بتایا۔

"اب جواب کون دے گا" پہلے نے پوچھا

"ہمارے سردار ہی دیں گے اور کون جواب دے گا" دوسرے نے کہا۔

"ذرا ان کا جواب بھی مجھے بتانا۔ کاش میری سماعت خراب نہ ہوتی" پہلے نے افسوس سے کہا۔

"لیکن تم ذرا خاموش رہو، میرے کان تو مت کھاؤ۔ میں تمہیں سردار کا جواب بھی بتا دوں گا وہ دیکھو سردار جواب دے رہا ہے" دوسرے نے کہا

"کون سا؟ کس طرف؟" پہلے نے پوچھا۔

اس نے ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور شرم سے گردن جھکائی ہوئی ہے دوسرے نے جواب دیا۔

"کہہ کیا رہا ہے؟" پہلے نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہہ رہا ہے کہ آپ بوڑھوں کے شریف بھتیجے اور جوانوں کے شریف بھائی ہیں سنو! سنو! محمدؐ کیا کہہ رہے ہیں۔ دوسرے نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے بھی تو بتاؤ انہوں نے کوئی اچھی ہی بات کہی ہے بتاؤ نا میرے بھائی، وہ کیا کہہ رہے ہیں؟" پہلے نے انتہائی بے تابی سے پوچھا۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں اور تم سب آزاد ہو" دوسرے نے خوشی سے دونوں ہاتھ اچھالتے ہوئے کہا۔ "کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا" کیا دنیا کی تاریخ میں پہلے بھی ایسا کبھی ہوا ہے؟ میں تو آج سے مسلمان ہوتا ہوں، پہلے نے کہا۔ دوسرا بولا تم ہی کیا اس وقت یہاں کھڑے ہوئے سبھی لوگ کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے شریف بھتیجے نے شہر کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی فتح کر لیا ہے۔

بکرے پارے

شاہ نواز فاروقی

سر فراڈ

کل اپنے ایک دوست سے مجھ کو خبر ملی
بکروں کے دام دیکھ کے بولے یہ سر فراڈ
دِل کے مریض جائیں نہ بکرا خریدنے
ٹی وی پہ اشتہار چلاؤ ۔ برائے گاڈ

شارٹ کٹ

دُنبہ نہ پا کے میرے بھتیجے نے طیش میں
موٹا سا اپنے ہاتھ میں ڈنڈا اُٹھا لیا
یوں اِس طرح سے اُس نے بہت تھوڑی دیر میں
بکرے کو مار مار کے دُنبہ بنا لیا

اِنکم

دیکھی جو بقر عید پہ انکم قصائی کی
ٹُوٹُو سے ابّو جان یہ بولے کہ مائی سَن
بے کار ہے پڑھائی وڑھائی کا سِلسلہ
تُو اِس کو چھوڑ چھاڑ ۔ خُدارا قصائی بَن

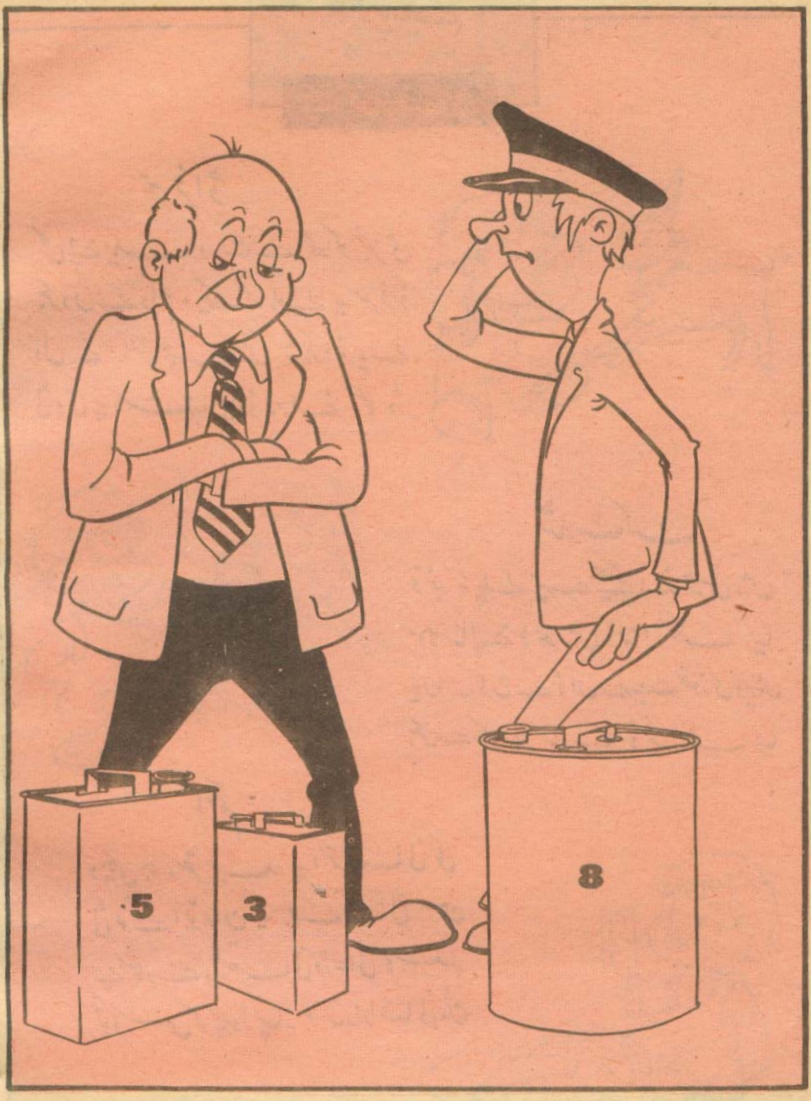

ان صاحب کو صرف چار گیلن تیل چاہیئے مگر ڈبے پانچ اور تین گیلن کے ہیں۔ اب کیا ہوگا ذرا ان کی مدد تو کریں

ارشد کی سائیکل

اسماء ھارون

اپنے ابّو سے فرمائش کرنے سے قبل یہ کہانی ضرور پڑھیے

پچھلے چند دنوں سے، ارشد کی ضد میں اصرار بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بہت مُصر تھا کہ اسے سائیکل دلوائی جائے اگرچہ اس کے والد اُس کی ضد کی عادت سے بخوبی آگاہ تھے، مگر جانے کیا وجہ تھی کہ وہ اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے تھے۔ شاید انہیں موجودہ بجٹ کی وجہ سے تنخواہ میں اضافہ ہونے تک کا انتظار تھا!

"بیٹا ارشد!" انہوں نے ایک دن دفتر سے واپسی پر بیٹے کو پاس بُلا کر، بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ "ہم اگرچہ اللہ کے فضل سے متوسط الحال ہیں، تاہم میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ آپ کو سائیکل دلوا سکوں اس کے لیے قدرے انتظار کرنا ہوگا۔" ان کا انداز تخاطب ہمیشہ مؤدب الفاظ لیئے ہوئے ہوتا تھا۔ گھر میں بھی

اور گھر سے باہر بھی وہ چھوٹے بڑوں، ہر ایک سے اسی لہجے میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔!

"ابّو جان!" ارشد بولا۔ "میرے اڑوس پڑوس میں سبھی لڑکوں کے پاس سائیکلیں ہیں، اور میں آج بھی بسوں کے دھکے کھاتا ہوا، اسکول پہنچتا ہوں۔ اس سے مجھے سُبکی محسوس ہوتی ہے ابو جان!"

"بات تو صحیح ہے.... لیکن مَیں بھی تو بس یا ویگن کے ذریعے جوں توں دفتر جاتا ہی ہوں اور شام کو گھر واپسی بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب سہنی پڑ رہی ہے!"

خلافِ معمول اس موقع پر ارشد خاموش سا ہو گیا۔

اور ایک دِن یوں ہوا کہ ارشد اپنے ابّا کے ہمراہ، جمعہ کے دِن سودا سلف خریدنے بازار گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص ایک بیساکھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اچانک ارشد کی آنکھوں میں پلک بھر کے لئے ایک چمک سی پیدا ہوئی.... ابھی بازار کے وسط میں ہی پہنچے تھے، کہ اُسے ایک لڑکا نظر آیا۔ جو دایاں ہاتھ اوپر کو اُٹھاتا تھا اور پورے جسم کو قدرے بائیں جانب جھکاؤ دے کر اپنا اگلا قدم آگے بڑھاتا تھا۔ ارشد کے والد نے کنکھیوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جو ٹکٹکی باندھے اس معذور لڑکے کو چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ خریداری کرنے کے بعد، گھر پلٹتے وقت ایک اور منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ایک فقیر منا آدمی مخالف سمت سے سڑک پر گھسٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اس بچارے کی دونوں ٹانگیں گھٹنے گھٹنے تک کٹی ہوئی تھیں۔ شاید کسی اندوہ ناک حادثے کی نذر ہو گئی تھیں۔

گھر پہنچ کر ارشد کے والد ابھی ہاتھ مُنہ دھو کر ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھنے ہی پائے تھے، کہ ارشد بھی تولیئے سے ہاتھ مُنہ پونچھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اپنے ابّو کی کرسی کے قریب رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ابّو جان! اب میں آپ سے سائیکل کی خریداری کے لیے جلد بازی نہیں کروں گا!"

"بڑی اچھی بات ہے بیٹے! لیکن یہ "انقلاب" کیسا؟" باپ نے مُسکراتے ہوئے، حیرت و مسرت کی ملی جُلی آواز میں ارشد سے دریافت کیا۔

"بس ابّو جان! اللہ تعالیٰ نے مجھے دو تندرست و توانا پاؤں عطا کیے ہیں۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اپاہج یا لنگڑا لُولا نہیں بنایا۔ سائیکل کا کیا ہے، جب آپ کو سہولت ہو لے دیجئے گا۔" ارشد نے شاید آج کے دیکھے ہوئے مختلف مناظر سے متاثر ہو کر اپنے دِل کی بات کہہ دی!

اور دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے صاف دِل ابّو جان کے گلے سے لگا ہوا، ان سے آئندہ ہونے والے امتحان کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

آؤ گھومیں دُنیا

پہلے قسطنطنیہ

عُبید اللہ کیہر

سفرنامۂ ترکی کا آخری حصّہ

گزشتہ ماہ "سالگرہ نمبر" میں ہم نے پاکستان کے قریبی دوست اور عظیم اسلامی ملک ترکی کا ایک سفرنامہ شائع کیا تھا۔ طوالت کی وجہ سے سفرنامے کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ پہلا حصّہ تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ دوسرا اور آخری حصّہ اس ماہ پیشِ خدمت ہے۔ جو ساتھی سفرنامے کا ابتدائی حصّہ نہیں پڑھ سکے، اُن کے لیے ابتدائی حصّے کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تین پاکستانی بچّوں فہد، ارشد اور اسد کا سفرنامہ ہے، جن کے ابّو ملازمت کے سلسلے میں ترکی کے دارالحکومت انقرہ میں مقیم ہیں۔ اور اپنے بچّوں کو انقرہ سے استنبول لے جاتے ہیں۔ استنبول کا پُرانا نام قُسطنطنیہ ہے۔ جو بحیرۂ مرمرا اور بحیرۂ اسود کے درمیان واقع ہے۔ ان دونوں سمندروں کو ملانے والی آبی سرحد دراصل یورپ اور ایشیا کو جُدا کرتی ہے۔ استنبول کا زیادہ تر حصّہ یورپ میں واقع ہے۔ یہاں وہ سب سے پہلے جامع مسجد سلطان احمد جاتے ہیں اور دن بھر اس خوبصورت عمارت کے مختلف حصّے دیکھنے میں گزارتے ہیں۔ مسجد کی بھرپور سیر کے بعد جب وہ احاطے سے باہر نکلے تو شام ہونے والی تھی۔

"لڑکو! یہ وقت کہہ رہا ہے کہ اس وقت ہمیں "شاخِ زرّین" پر ہونا چاہیے۔" ابّو بولے۔

"یہ شاخِ زرّیں کیا کوئی درخت کی شاخ ہے؟" اسد نے معصومیت سے کہا تو ابّو ہنس پڑے۔

"نہیں بیٹا! تم چلو تو وہیں جا کے پتا چلے گا کہ وہ کیسی شاخ ہے۔" انھوں نے کہا۔

وہ سب پھر ایک بس میں بیٹھے اور سمندر کے کنارے جا کر اُترے۔ ایک کنارے سے دوسرا کنارہ۔۔۔ صاف نظر آ رہا تھا۔ اور وہاں بھی عمارتیں تھیں اس لیے سمندر ایک بڑی نہر لگ رہا تھا اور دونوں کناروں کو ایک دو منزلہ پُل ملا رہا تھا۔ جس کے اوپری حصّے میں گاڑیاں چل رہی تھیں اور نیچے مارکیٹ تھی۔

"یہ غلطہ پُل کہلاتا ہے" ابّو نے بتایا۔ وہ بازار کے اندر گھوم رہے تھے۔ جہاں ترک خوانچہ فروش چھوٹی چھوٹی چیزوں کے کھوکھے لگائے بیٹھے تھے۔ کوئی الیکٹرونک گھڑیاں بیچ رہا تھا۔ کوئی صابن، کوئی سگریٹ کے لائٹر تو کہیں کم عمر لڑکے بوٹ پالش کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔

"پُل غلطہ شاخِ زرّیں کے اندر جانے کا راستہ ہے" ابّو بتانے لگے "شاخِ زرّیں دراصل سمندر کی ایک کھاڑی ہے جو شہر کے اندر بندرگاہ تک چلی گئی ہے۔ جب شام کو سورج غروب ہونے والا ہوتا ہے تو اس کی سنہری کرنوں میں اس کا پانی بالکل پگھلے ہوئے سورج کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ اس لیے اُسے شاخِ زرّیں کہتے ہیں" انھوں نے بتایا۔ اسد شاخِ زرّیں کا مطلب جان کر بہت خوش ہُوا۔

ابّو پھر بولے "جب سلطان احمد استنبول فتح کرنے کے لیے آیا تو وہ بہت سارے سمندری جہازلے کر بندرگاہ کے اندر پہنچنا چاہتا تھا، مگر اب جس جگہ غلطہ پُل ہے وہاں پہلے ایک بہت مضبوط اور موٹی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ جب تک یہ زنجیر نہ ہٹائی جاتی تب تک کوئی جہاز بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس زنجیر کا کنٹرول شہر کے اندر تھا۔ سلطان احمد بڑا پریشان ہوا کہ وہ بندرگاہ میں کس طرح داخل ہو۔ مگر انسان کے اندر عقل اور ہمت ہو تو وہ ہر مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔ چنانچہ سلطان احمد نے بھی اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس مسئلے کا ایسا حل نکالا کہ دنیا آج تک حیران ہے۔ تم بتاؤ فہد انھوں نے اس مسئلے کا کیا حل نکالا؟" ابّو نے مسکرا کر فہد کو دیکھا۔

"ابّو یہ تو مجھے نہیں پتہ" فہد کھسیانا ہو گیا تو ابّو ہنسے اور بولے۔

"سلطان احمد نے شاخِ زرّیں کے برابر میں خشک زمین پر لکڑی کے لمبے لمبے تختے بچھا کر ان پر چکنی چربی ملوا دی اور اور اپنے سارے جہاز پانی سے نکال کر ان تختوں پر چڑھا دیے۔ رات کو جب ہوا چلی تو بادبان پھول گئے اور ہوا کے زور سے سارے جہاز تختوں پر پھسلتے ہوئے خشکی پر سے گزر کر زنجیر کی طرف راتوں رات شاخِ زرّیں میں داخل ہو گئے۔ جب صبح اہلِ قسطنطنیہ کی آنکھ کھلی تو انھوں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ زنجیر بدستور بند ہے مگر اس کے باوجود مسلمانوں کے جہاز بندرگاہ میں کھڑے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسی دن بغیر کسی جدوجہد کے قسطنطنیہ فتح ہو گیا" ابّو نے بات ختم کی تینوں حیران ہو کر سُن رہے تھے اور سلطان احمد کی عقلمندی پر خوش ہو رہے تھے۔

اب وہ پُل سے باہر نکل کر شاخِ زرّیں کے ساتھ ساتھ ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا اور سمندر کا پانی سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ سمندری پرندے آوازیں نکالتے ہوئے اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا ہو گیا اور کنارے کے ساتھ لگی ہوئی کشتیوں میں روشنیاں جگمگا اُٹھیں۔ انھیں بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انھیں تلی ہوئی مچھلی کی لذیذ خوشبو محسوس ہونے لگی۔ "ابّو بھوک لگ رہی ہے" ارشد نے کہہ دیا۔

"ہاں بھئی چلو میں تمھیں ایک زبردست چیز کھلاتا ہوں" ابّو نے ایک کنارے سے لگی ہوئی کشتی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جو لہروں کے چلنے سے ہلکورے لے

رہی تھی اور اچانک ان کو معلوم ہُوا کہ ہر کشتی میں آگ کا الاؤ جل رہا ہے اور مچھلی تلی جا رہی ہے۔ چند سو لیرا کے عوض تلی ہوئی مچھلی کا ایک لذیذ ٹکڑا بھوری ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے ساتھ اخبار میں لپٹا ہوا ہر ایک کو مل گیا اور وہ چلتے چلتے مچھلی کا سینڈوچ بھی کھاتے گئے۔ تارلا باشی میں ہوٹل بلوار کا مینجر انہی کا انتظار کر رہا تھا۔

صبح فجر کے وقت ابّو نے اُنھیں اُٹھایا تو پورے شہر میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ ان تینوں نے سردی کی وجہ سے وہیں ہوٹل کے کمرے میں ابّو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی اور پھر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ابّو ناشتے کا کہنے چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ناشتے میں اور بہت ساری چیزوں کے علاوہ لذیذ ترکی قہوہ بھی شامل تھا جو کہ مینجر کی طرف سے تھا۔

"پاکستانی برادر۔ مسلم برادر" اس کا چہرہ محبت سے بھرپور ہو رہا تھا۔

آج ابّو انھیں توپ کاپی عجائب گھر لے جا رہے تھے۔

ابّو یہ توپ کاپی کیا نام ہُوا؟ فہد نے پوچھا۔

دو دیہاتی ترک بچیاں۔

ایک بچہ اپنی ماں کے ہمراہ ایک تہوار کے موقعے پر

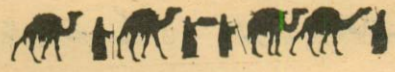

"بیٹا یہ دورِ خلافت میں بادشاہ کے محل کا نام تھا۔ خلافت ختم ہوگئی تو محل بھی ختم ہوگیا اور اب اس محل کو عجائب گھر کی صورت دے دی گئی ہے اور اُسے توپ کاپی محل کے بجائے توپ کاپی میوزیم کہا جاتا ہے۔"

وہ پہلے نبلی مسجد پہنچے۔ مسجد سے تھوڑے ہی فاصلے پر توپ کاپی تھا۔ ٹکٹ لے کر وہ اندر داخل ہوئے، اور عجائب گھر کے مختلف حصّے دیکھنے لگے۔ بادشاہوں کے سونے چاندی کے زیورات اور ہیرے جواہرات کے خزانے دیکھ کر اُنھیں حیرت ہو رہی تھی۔ کل بادشاہ ان سب چیزوں کو استعمال کرتے تھے اور آج وہ نمائش بنی ہوئی تھیں اور پھر وہ عجائب گھر کے اس حصّے میں گئے جس کا تعلق اسلامی تاریخ سے تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادرِ مبارک اور وہ مُہر دیکھی جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطوط اور احکامات پر لگاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں عقیدت سے بھر گئی تھیں۔ وہ حیران بھی تھے کہ اتنی قدیم چیزیں اب تک محفوظ کس طرح ہیں۔

توپ کاپی میوزیم بہت بڑا تھا اس لیے پورا ختم ہونے سے پہلے ہی وہ تھک گئے تھے چنانچہ باہر آگئے۔

"اب چلتے ہیں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضہ پر، جو کہ استنبول کی قدیم فصیل کے ساتھ ہے۔" ابّو نے کہا۔ "قسطنطنیہ پر شروع شروع میں مسلمانوں نے جو لشکر کشی کی تھی اس میں یہ برگزیدہ صحابی اور میزبانِ رسولؐ بھی شامل تھے۔ مگر یہاں پر وہ محاصرے کے دوران بیمار پڑ گئے اور انتقال فرما گئے۔" ابّو بتا رہے تھے۔ وہ ایک ٹیکسی میں شہر سے باہر کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کے چاروں طرف جو فصیل تھی وہ یوں تو کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھی مگر اب حکومت کی طرف سے اس کے تمام شکستہ حصّوں کی مرمت کر دی گئی تھی۔ سڑک دیوار کے ساتھ ساتھ تھی اور پرانے زمانے کی حفاظتی خندق کے کچھ آثار بھی نظر آ رہے تھے۔

وہ لوگ "مسجدِ ایوبؓ" پر جا اُترے جس کے پیچھے قبرستان تھا۔ اور وہاں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا روضہ تھا۔ ان کے ابّو کی حالت وہاں عجیب ہو رہی تھی۔ قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

خاموشی سے ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھتے ہوئے سعد نے چشمِ تصوّر سے دیکھا کہ رسولِ اکرمؐ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے ہیں اور اہلِ مدینہ میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ اللہ کے پیارے نبیؐ انہی کے گھر قیام کریں تب یہ طے پاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جس صحابی کے سامنے جا کر رُک جائے، میزبانی کا شرف اُنہی کو حاصل ہوگا۔

نبیؐ کی اونٹنی مدینے کی گلیوں سے گزرتی ہے۔ نگاہیں اونٹنی کے قدموں پر جمی ہیں کہ دیکھیں کہ یہ قدم کہاں ٹھہرتے ہیں۔ اونٹنی ایک مکان کے نزدیک جا کر رُکتی ہے، پھر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ حضرت ایوب انصاری کا گھر ہے۔ قرعۂ فال انہی کے نام نکلا ہے، ہاں یہ وہی حضرت ایوب انصاریؓ ہیں... وہی... یہ سوچتے سوچتے سعد کی آنکھوں سے خود بخود آنسو رواں ہو گئے اور وہ بھی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگا۔

آزادیوں کے سائے

صباحت شکیل

ربِّ جلیل لے کر آزادیوں کے سائے
چودہ اگست کا دن اب بار بار آئے

شمعیں رہیں فروزاں ہر گھر میں زندگی کی
جاگی رہے تمنّا ہر دل میں بندگی کی
ہر صبح آگہی کا تازہ پیام لائے
ربِّ جلیل لے کر آزادیوں کے سائے

گم گشتہ عظمتیں ہوں اس خاک سے ہویدا
فاروقؓ اور غزالیؒ ہوں اس زمیں پہ پیدا
اسلام تاکہ ساری دُنیا میں پھیل جائے
ربِّ جلیل لے کر آزادیوں کے سائے

دامن ہمارے مالک علم و ہنر سے بھر دے
ہو آرزو شہادت جن کی ہمیں وہ سر دے
لبّیک ہو لبوں پر جب بھی وطن بُلائے
ربِّ جلیل لے کر آزادیوں کے سائے
چودہ اگست کا دن اب بار بار آئے

PID (Islamabad)
manhattan International

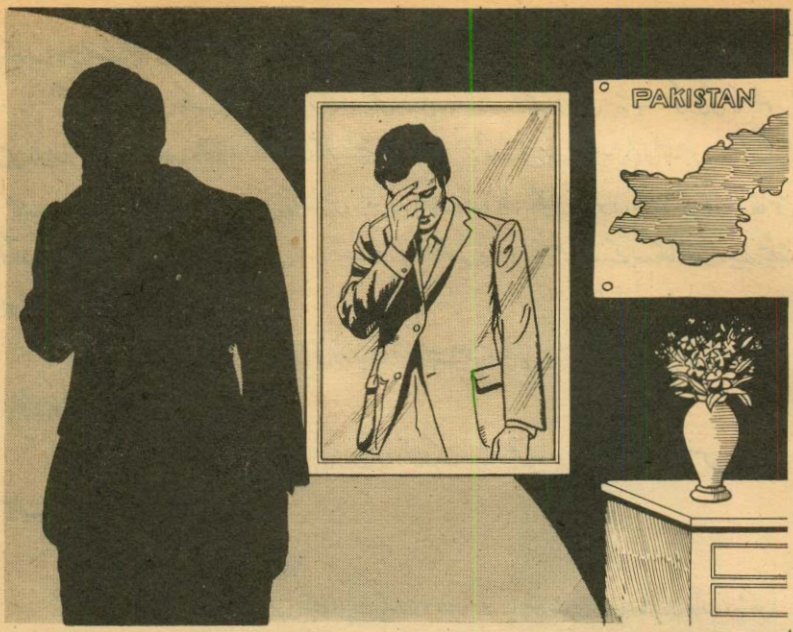

کھویا ہُوا چہرہ

اُس پاکستانی کا قصّہ جس نے
دولت کیلئے اپنی شناخت کھو دی

ان شہباز خان

شمس گل ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں صوفے پر بیٹھا سوچوں میں گُم تھا۔ سُوٹ کیس اُس کے پیروں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ گھر والوں سے مل لینے کے بعد اُس نے خود ہی اُنھیں واپس جانے کی ہدایت کر دی تھی۔ اب وہ تنہا تھا جب اُسے تنہائی میسّر آئی تو سوچوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

اُس کا تعلق متوسّط گھرانے سے تھا۔ اُس کے باپ نے بڑی مُشکل سے اُسے ایم۔ اے تک تعلیم دلوائی تھی۔ وہ اپنے نو بہن بھائیوں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اُس کے بعد صرف اس کی ایک بہن ہی میٹرک کر پائی تھی۔ باقی سب تو پرائمری سے آگے بڑھ ہی نہیں سکے تھے۔ اُس کے دو چھوٹے بھائی شادی شُدہ اور صاحبِ اولاد تھے اور بندرگاہ پر اپنے باپ کے ساتھ مال برداری کی نوکری کرتے تھے۔ مگر شمس کو اس کام سے سخت چڑ تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے

کے بعد وہ ملازمت تلاش کرتا رہا، مگر اُسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

"کچھ نہیں رکھا اس ملک میں۔ نہ اچھی نوکری، نہ اچھی زندگی۔ اس مُلک کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے"۔ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرنے کے بعد وہ تھکا ہارا گھر واپس آکر غصّے سے بولا۔ "میں یہ مُلک، یہ سرزمین چھوڑ دُوں گا۔ جس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ ویسے بھی کیا خاص بات ہے، اس مُلک میں۔ چھوٹے چھوٹے گھر، تنگ گلیاں، دھواں، گرد، مٹی، گاڑیوں کا شور لوگوں کی بھیڑ۔ کیا کشش ہے، ان چیزوں میں؟... سب بکواس۔ فضول"۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کے لیے بیٹھتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"بیٹا، نوکری مل ہی جائے گی۔ اس طرح تو ہوتا ہے۔ مگر ہمّت نہیں ہارنی چاہیے"۔ ماں تخت پوش پر اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں امّاں! اب یہاں رُک کر میں اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ میں باہر جا رہا ہوں"۔ شمس نے فیصلہ سُنایا۔

"کہاں...؟" ماں پریشان ہو گئی۔

"انگلینڈ...! میں نے بات بھی کر لی ہے، اپنے ایک دوست سے۔ پاسپورٹ بن رہا ہے۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ ویزا بھی مل ہی جائے گا۔ بس کرائے کا مسئلہ ہوگا۔ اس کے لیے قرض لیا جاسکتا ہے... نہیں، فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہاں ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ جاتے ہی نوکری پر لگ جاؤں گا۔ پہلے ہی مہینے تنخواہ بھیج دُوں گا۔ وہاں کی تنخواہ اتنی ہے کہ قرض اُترنے کے بعد بھی رقم بچ جائے گی!" شمس نے ماں کو اطمینان دلایا۔

"ہیں... بڑے بھیّا! تو کیا آپ باہر جا رہے ہیں؟" چھوٹا باسط اُس کے پاس آکر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ گھر کے باقی افراد بھی چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ پھر دھیرے دھیرے سب آ آ کر اُس کے گرد جمع ہونے لگے۔

"ہاں، ڈھنڈورچی...! کیا سارے محلے کو بتائے گا"۔ شمس نے باسط کو ڈانٹ پلائی، مگر وہ بُرا مانے بغیر مسکراتا رہا اور چھوٹی آپا کا مُنہ چڑانے لگا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا، بڑے بھیّا!" باسط اُس سے لپٹنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"تو کیا تُو نے باہر جانے کا پکّا ارادہ کر لیا ہے؟" ماں کو جیسے اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں"۔ شمس نے قطعی انداز میں کہا۔ ماں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے خاموشی سے اُٹھ گئی۔ گھر کے باقی لوگ شمس کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کسی اور دُنیا سے آیا ہو۔ اُس کی بہنیں اور دونوں بھابیاں نظروں ہی نظروں میں اُس پر واری ہوئی جا رہی تھیں۔

"یہ لیجیے بھائی جان، پانی" چھوٹی بہو تہمینہ پانی سے بھرا گلاس شمس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"پانی تو رکھا ہے" شمس کچھ حیران ہوا۔

"تو کیا ہوا بھائی جان! یہ بھی رکھ لیجیے۔ ہو سکتا ہے، ضرورت پڑ جائے" تہمینہ اپنائیت سے بولی۔ اور گلاس تخت پر رکھ دیا۔

"ہو سکتا ہے، ضرورت پڑ جائے"! بڑی بہو سمیرا منہ بگاڑ کر اُس کی نقل اُتارتے ہوئے زیرِ لب بولی اور جا کر پانی کا لوٹا اُٹھا لائی۔

"بھائی جان ہاتھ دھو لیجیے" سمیرا نے لوٹا نیچے تخت کے ساتھ رکھتے ہوئے فرمانبرداری سے کہا۔

"مگر ابھی تو میں کھا رہا ہوں" شمس کو غصّہ آنے لگا۔

"ہاں۔ میرا مطلب ہے، کھانے کے بعد دھو لیجیے گا" سمیرا اس کے غصّے کا بُرا مانے بغیر اسی انداز میں بولی۔

یوں شمس، جو پہلے بے روزگار ہونے کی وجہ سے گھر والوں کی تنقید کا نشانہ بنتا تھا، ایک دم اہمیت اختیار کر گیا اور گھر کا خاص فرد بن گیا۔ گھر کے سارے افراد اُس کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتے تھے اور ذرا ذرا سے کام کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

باپ نے بھاگ دوڑ کر کے اِدھر اُدھر سے اتنی رقم کا بندوبست کر لیا تھا، جو اُس کے کرائے کے لیے کافی تھی۔ اس دوران میں شمس کو پاسپورٹ اور ویزا بھی مل گیا تھا۔

آخر وہ دن آ گیا، جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ جلوس کی شکل میں ائیر پورٹ کی طرف رواں دواں تھا۔ گھر والوں سے مل کر اُس نے اُنھیں رخصت کر دیا اور اندر بڑھ گیا۔ کچھ دیر میں معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہو گا۔

"خواتین و حضرات! لندن جانے والی فلائٹ نمبر پی۔ کے ۔۔۔ جانے کے لیے تیار ہے" اچانک دیوار گیر اسپیکر سے آواز بلند ہوئی اور شمس چونک کر خیالوں کی دُنیا سے نکل آیا۔ سُوٹ کیس اُٹھا کر وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

شمس کے دوست نے اُسے لندن میں ایک اچھی ملازمت فراہم کی تھی اور شمس بے حد خوش تھا۔ اُسے یہ شہر بہت پسند آیا تھا۔ صاف ستھرا، چمکتا دمکتا، وہاں کی چیزوں کو وہ تیزی سے اپناتا چلا گیا۔ فارغ اوقات میں اُس نے وہاں کے مختلف مقامات کی جی بھر کے سیر کی۔ یوں پلک جھپکتے میں ڈھیر سارے مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں وہ ہر مہینے پابندی سے رقم گھر بھیجتا رہا۔ اُن کا قرضہ بھی اُتر گیا تھا اور گھر کے حالات بھی خاصے بہتر ہو گئے تھے۔

شمس یہاں کے لوگوں میں گھُل مل تو گیا تھا، مگر کبھی کبھی اُسے بڑی شدّت سے اجنبیت کا احساس ہونے لگتا۔ اُسے یوں محسوس

ہونا، جیسے وہ اپنا چہرہ کہیں کھو چکا ہے۔ اُس کی شناخت اُس سے چھن گئی ہے۔ کسی دعوت میں، کسی پارٹی یا تقریب میں وہ انسانوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا۔ اس کا دل اس چمکتے دمکتے، صاف ستھرے شہر سے بھر گیا تھا۔ اُسے اپنے ٹلک، اپنے شہر کی یاد ستانے لگی تھی۔ اُسے اپنے یہاں کی تنگ اور گندی گلیاں۔ بازاروں میں لوگوں کا جمِ غفیر۔ چٹ پٹے کھانے۔ گاڑیوں کا شور اور ہاؤ ہو یاد آتی تھی۔ بسنت کے موسم میں اُسے اپنے یہاں کی پتنگ بازی کے پیچ یاد آتے تھے۔ برسات کے دِنوں میں اُسے گرم گرم پکوڑے اور کچوریاں یاد آنے لگتیں۔ اُس نے باہر جانے کا فیصلہ کرتے وقت ان سب چیزوں کو رد کر دیا تھا، مگر اب ان سب باتوں سے اُسے شدید اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ان چیزوں کے بغیر اُسے اپنا آپ ادھورا اور غیر محسوس ہوتا۔

دفتر میں بھی وہ کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار تھا۔ شروع میں اُس کے انچارج نے اُسے ظہر اور عصر کی نماز کے لیے کچھ دیر کی رخصت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر پھر بعد میں اُس نے جب انچارج سے شدید بحث کی، بلکہ جھگڑا کیا تو وہ بادلِ نخواستہ مان گیا۔ چونکہ مسجد اُن کے دفتر سے خاصی دُور تھی، اس لیے وہ دفتر ہی کے ایک کونے میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرتا تھا۔ اُس نے وہاں کے بازار سے ایک خوب صورت سا جاء نماز بھی خرید لیا تھا۔ وہ جب نماز پڑھ رہا ہوتا، اُس کے بیشتر ساتھی اُس پر ہنستے اور اُس کا خوب مذاق اُڑاتے۔ مگر اُن کی باتیں اس کے خشوع و خضوع میں مزید اضافہ کرتیں۔

پھر رمضان المبارک شروع ہو گیا۔

اب تو گویا دفتر والوں کو شمس کی تحقیر و تضحیک کرنے کا ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ اس کے روزہ رکھنے پر بے طرح ہنستے اور اُسے بے وقوف اور احمق کے خطابات سے نوازتے۔ اُسے دقیانوسی، رجعت پسند اور لکیر کا فقیر قرار دیتے۔ کھانے پینے کی اشیاء ہونے کے باوجود چودہ پندرہ گھنٹے بھوکا پیاسا رہنے پر وہ سب اُس کا اتنا مذاق اُڑاتے کہ وہ زچ ہونے لگتا۔

"یہ سب چیزیں میرے مذہب کا حصّہ ہیں۔ میری شخصیت کا جُز وہیں۔ میں انھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" اُس نے اپنے ساتھیوں کو جواب دیا۔

"واہ! اگر ایسا ہی ہے تو تم اپنا ملک چھوڑ کر یہاں کیوں آئے؟" طنزیہ انداز میں پوچھا گیا۔

"اس لیے کہ...!" شمس یکایک خاموش ہو کر انھیں گھورنے لگا۔ اُن سب کے چہرے عجیب سے ہونے لگے تھے۔ اُن کی ناکیں موٹی اور لمبی ہو گئی تھیں اور بڑے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔

"ہاں، ہاں، بولو۔ کس لیے؟" لمبی اور موٹی ناک اور بڑے بڑے دانتوں والے ایک چہرے نے پوچھا۔

"اس لیے کہ..." شمس نے دانت پیستے ہوئے کچھ کہنا چاہا، مگر الفاظ نے اُس کے خیال کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"اس لیے کہ تم وہاں بھوکے مر رہے تھے۔" اُس شخص نے اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر شمس کی جانب دیکھتے ہوئے

حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

شمس کو محسوس ہوا، جیسے اُس کے اندر کچھ بھربھرا کر گر گیا ہے۔ بالکل اُس طرح، جیسے تیز بارش میں کچے مکان بھربھرا کر گرتے ہیں۔ وہ بے خودی کے عالم میں کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز چلتا ہوا دفتر سے باہر آ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ وہ غصّے اور دُکھ کی کیفیت میں یوں ہی لندن کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ یونہی گھومتے گھومتے وہ کتابوں کی ایک دُکان میں داخل ہو گیا۔ اور بے مقصد کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یکایک اُس کی نظر دُکان میں رکھے ہوئے ایک اسٹینڈ پر پڑی جس پر دُنیا کے مختلف ممالک کے نقشے لٹکے ہوئے تھے۔ اِنھی نقشوں میں اُسے پاکستان کا نقشہ بھی لٹکا ہوا دکھائی دیا۔ شمس کی نظر جیسے ہی پاکستان کے نقشے پر پڑی، اُس کے جسم میں لمحے بھر کے لیے سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اور اس کا جسم سخت سردی کے باوجود پسینے سے بھیگ گیا۔ اُس نے ایک عجیب عالمِ بے خودی میں پاکستان کا نقشہ خریدا اور بہکتے قدموں سے چلتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر شمس نے ایک لمحے کی دیر کیے بغیر اپنے سونے کے کمرے کی دیوار پر اُس نقشے کو آویزاں کیا اور تیزی سے گھر کی تمام لائٹیں روشن کر دیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور اُس میں اپنی شبیہہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یکایک اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو لکیریں نکل کر اُس کے دامن کو بھگونے لگیں۔ آج اُسے اپنا کھویا ہوا چہرہ واپس مل گیا تھا۔

اپنی تحریر ہمیں بھیجنے سے قبل اسے ضرور پڑھ لیجیے!

بعض کُتب اور رسائل میں اکثر ایسی بہت سی معلومات یا معلومات پر مبنی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کا کوئی مُستند یا مُعتبر حوالہ نہیں ہوتا اور تحقیق پر پتا چلتا ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معلومات یا واقعات کو محض کُتب یا رسائل میں شائع ہو جانے کی وجہ سے مستند سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک سے دوسرے تک اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود ان کے علم کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ "آنکھ مچولی" نے معلومات کو اُن کی مکمّل صحت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی معلومات کی اشاعت سے گریز کرے گا، جن کا کوئی مستند حوالہ نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنا ہے کہ وہ جب بھی کوئی معلوماتی تحریر، معلوماتِ عامّہ یا تراشے کی شکل میں کوئی معلومات بھیجیں تو اُس کے ساتھ اُن کُتب یا رسائل کا حوالہ ضرور دیں، جہاں سے ان معلومات کو اخذ کیا گیا ہے۔ غیر مستند معلومات "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں کی جا سکیں گی۔

آپ کتنے ذہین ہیں

اُمِّ رباب جعفری

ذیل میں آپ کی ذہانت کی آزمائش کے لئے چند سوالات دیئے جا رہے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات دیجئے اور اندازہ لگائیے آپ کتنے ذہین ہیں؟

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی معلوم ہونے سے پہلے دنیا کا بلند ترین پہاڑ کون سا تھا؟

(۲) سلمیٰ، نجمہ کی کزن ہے۔

نجمہ، ریحانہ کی کزن ہے۔

مگر ریحانہ، سلمیٰ کی کزن نہیں ہے۔ بتائیے یہ کس طرح ممکن ہے؟

(۳) امجد بیمار پڑا تو ڈاکٹر نے اُسے پانچ گولیاں ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے کھانے کے لئے دیں۔ امجد نے وہ پانچوں گولیاں کتنی دیر میں ختم کی ہوں گی؟

(۴) شاہد صاحب روزانہ لوکل ٹرین سے دفتر جاتے تھے۔ ٹرین ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی اور ان کا گھر اسٹیشن سے دو میل دور تھا۔ ایک دن وہ ۷ بج کر ۵۸ منٹ پر گھر سے نکلے اگر پہلا میل انہوں نے ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کیا ہو تو بتائیے انہیں دوسرا میل کس رفتار سے طے کرنا چاہیئے تاکہ وہ ٹرین پکڑ سکیں؟

(۵) "اس جملا میں تین غلطی ہیں۔"

کیا آپ ان تین غلطیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

جوابات کسی اور صفحے پر تلاش کیجیے۔

جنابِ صدر! دو آنسو ہمارے لیے بھی

صدرِ مملکت کے نام ایک بچّے کا اُداس خط

طاہر مسعود

جنابِ صدر! السلام علیکم!

میرا نام عُرفی ہے اور ابھی میں اسکول میں پڑھتا ہوں۔ یہ ایک سرکاری اسکول ہے۔ اس میں بیٹھنے کے لیے بنچیں اور ڈیسک نہیں ہیں، کرسیاں نہیں ہیں، بلیک بورڈ نہیں ہے، کھیلنے کے لیے میدان نہیں ہے۔ کلاس روم ہیں لیکن کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہم بچّے فرش پر بیٹھتے ہیں اور سر اٹھا کے اسلامیات کے ماسٹر صاحب کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو ہمیں چلّا کر بتاتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور یہ زمین و آسمان اسی نے بنائے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ اسکول کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے؟ اس اسکول کی کرسیاں اور میزیں کون چُرا کر لے گیا ہے۔ ریاضی کے ماسٹر صاحب گزشتہ چھ مہینے سے اسکول سے کیوں غائب ہیں اور ہر دوسرے دن کسی نہ کسی بہانے سے ہم بچّوں سے چندہ کیوں لیا جاتا ہے۔

جنابِ صدر، میرے اسکول کا نام گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول ہے۔ لیکن سب اسے پیلا اسکول کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی دیواریں پیلے رنگ کی ہیں اور غذائیت کی کمی کی وجہ سے یہاں کے طالب علموں کے چہرے بھی پیلے ہیں۔ یہاں اُردو میں پڑھائی ہوتی ہے، ہمارے اُستاد اور ہم سب اُردو میں باتیں کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اچھے گھرانوں کے بچّے یہاں داخلہ نہیں لیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیلے اسکول سے پڑھنے والے بچّے ترقی نہیں کر سکتے۔ جنابِ والا، ہم بچّے ایسی باتوں کی پروا نہیں

کرتے۔ کیوں کہ اس وقت ہمیں ترقی نہیں، کرسیاں، میزیں اور بلیک بورڈ چاہیے۔ جنابِ عالی! ہمارے سر پر ہیت موجود ہیں لیکن ہمارا اسکول یتیم ہے۔ اور اسکول میں پڑھتے ہوئے کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ شاید ہم بھی یتیم ہی ہیں۔ ہمارے اسکول کو ایک سرپرست چاہیئے۔ ایک ایسا سرپرست جو زر پرست نہ ہو۔

جنابِ صدر! میں آپ سے محبت کرتا ہوں بلکہ ہمارے اسکول کے سارے بچے ہی آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب بھی آپ کسی ملک کے مہمان صدر کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے اسکول کے سارے بچوں کو آپ کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر لے جایا جاتا ہے۔ جہاں ہم چلچلاتی دھوپ میں اپنے ہاتھوں میں رنگین جھنڈیاں لیے گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔ ہمارے جسم پسینے میں شرابور اور ہمارے چہرے سورج کی تپش سے لال ہو جاتے ہیں۔ پیاس سے ہمارے حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں اور ہم میں سے کئی لاغر اور بیمار جسم والے لڑکے گر پڑتے ہیں۔ لیکن ہم پھر بھی آپ کے انتظار میں قطار باندھے مؤدب کھڑے رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی استقبال کے موقع پر میں نے آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی جب آپ مہمان صدر کے ساتھ چمکیلی سیاہ مرسڈیز پر تیز رفتاری سے گزر رہے تھے۔ ہم نے ہدایت کے مطابق ملی چھاڑ کے خیر مقدمی نعرے بھی لگائے تھے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر ہم تھکن سے نڈھال نہ ہوتے تو اور شدت سے زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ مجھے یاد ہے اگلی صبح اخبار میں غیر ملکی صدر اور آپ کے استقبال کی تصویری جھلکیاں چھپی تھیں لیکن ان تصویروں میں پیلے اسکول

جنابِ صدر! پتہ نہیں ایسا کیوں ہے؟ جب بھی میں ورکشاپ پر ننھے بچوں کو اُستاد کی گالیاں کھاتے دیکھتا ہوں، جب بھی میں کسی کولڈ کارنر پر انھیں گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے، آئسکریم پہنچاتے، محنت مزدوری کرتے یا بھیک مانگتے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں رونا شروع کر دوں لیکن سب کے سامنے رونا بُری بات ہے۔ میں نے ایسے بچے بھی دیکھے ہیں جو گندگی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے باسی روٹیاں، کھانے پینے کی چیزیں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور فالتو اشیاء ڈھونڈتے ہیں اور انھیں اپنی بوری میں بھر کے لے جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے ایسے بچوں کو دیکھا ہے یا نہیں اور آپ نے ان بچوں کے مسائل پر کبھی سوچا بھی ہے یا نہیں۔

جنابِ صدر! یہ آپ کے ملک کے بچے ہیں۔ آپ اس ملک کے سربراہ ہیں اس لیے یہ آپ کے بچے ہیں۔ اور اگر یہ آپ کے بچے ہیں تو پھر جب بھی قومی بجٹ آتا ہے تو اس میں ان بچوں کا کوئی حصّہ کیوں نہیں ہوتا۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی رقم کیوں مختص نہیں کی جاتی۔ جنابِ عالی! اگر آپ ملک کے سارے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو کم سے کم میرے اسکول کے لیے کرسیاں اور میزیں ضرور فراہم کر دیجیے۔ اور اگر آپ یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر مجھے رونے کی اجازت دیجیے کیوں کہ اب مجھ سے آنسو نہیں پیے جاتے۔

کے سینکڑوں بچوں کی تصویریں نہیں تھیں۔ تصویر تھی تو صرف دو خوب صورت بچوں کی جو ران دے پر غیر ملکی صدر کو گلدستہ پیش کر رہے تھے۔ میں نے تصویر دیکھنے کے بعد اپنے بابا سے پوچھا تھا "بابا یہ کس کے بچے ہیں؟"

بابا نے کہا "یہ کسی بڑے آدمی کے بچے ہوں گے۔"

میں نے کہا "بابا۔ آپ بڑے آدمی کیوں نہیں ہیں؟"

بولے "دماغ نہ چاٹو، بھاگ جاؤ۔"

جناب صدر یہ بھی اسی دن کا واقعہ ہے جب ہمیں سوزوکی میں ٹھونس ٹھانس کر واپس اسکول چھوڑنے لے جایا جا رہا تھا اور سگنل پہ ہماری گاڑی رکی تھی تو میں نے دیکھا تھا کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے دو تین بچے، پھولوں کے ہار بیچ رہے تھے۔ کچھ بچے اپنے ہاتھوں میں اخبارات اٹھائے بھاگتے پھرتے تھے۔ آگے جا کر چند ایک بچے گاڑی صاف کرنے والا ڈسٹر لیے "پانچ روپے کا تین، پانچ روپے کا تین" کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے اپنے سر سے پوچھا۔

"سر! صدر صاحب نے ان بچوں کو دیکھا ہو گا؟"

سر ہنس کر بولے "بے وقوف! جب صدرِ مملکت کی گاڑی گزرتی ہے تو سڑکیں صاف کر دی جاتی ہیں۔ نہ ٹریفک ہوتا ہے اور نہ یہ گندے بچے۔"

جناب صدر، پچھلے دنوں میں نے ٹیلی وژن پر آپ کی تقریر سنی، جس میں آپ کئی بار روئے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر میں بہت حیران ہوا۔ کیوں کہ مجھے امی نے بتایا تھا کہ بڑے آدمی رویا نہیں کرتے۔ میں نے امی سے پوچھا بھی کہ کیا انھیں رونا نہیں آتا۔ امی کہنے لگیں نہیں انھیں رونا تو آتا ہے لیکن وہ اپنے آنسو پی جاتے ہیں سب کے سامنے رونا اچھی بات نہیں ہوتی جنابِ عالی جب سے میں نے امی کی یہ بات سنی ہے۔ میں نے بھی اپنے آنسوؤں کو پینا سیکھ لیا ہے۔ دن بھر میں کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر رونا آتا ہے لیکن میں نہیں روتا۔ ایک دن میں نے اپنے بابا سے اسکول کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ "ہمارے ملک میں ہزاروں سرکاری اسکول ایسے ہی ہیں۔ شہروں، دیہاتوں اور قصبوں میں تو بچے درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ ننگی زمین ان کی بنچ ہوتی ہے اور کھلا آسمان اسکول کی چھت۔ ان بچوں کو اچھی غذا، پینے کے لیے صاف پانی اور رہنے کے لیے ڈھنگ کے گھر بھی میسر نہیں ہیں۔ وہ ڈھور ڈنگروں کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں۔ اغوا کر لیے جاتے ہیں۔ بیگار کیمپ پہنچا دیے جاتے ہیں۔ جرائم پیشہ لوگوں کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں۔ اور بڑے ہو کر خود بھی جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں۔" میں بابا کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن جب وہ یہ سب کچھ بتا رہے تھے تو مجھے لگا کہ میری آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی ہے۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ گیا تاکہ بابا کی نظروں سے چھپ کر آنسوؤں کو پی سکوں۔

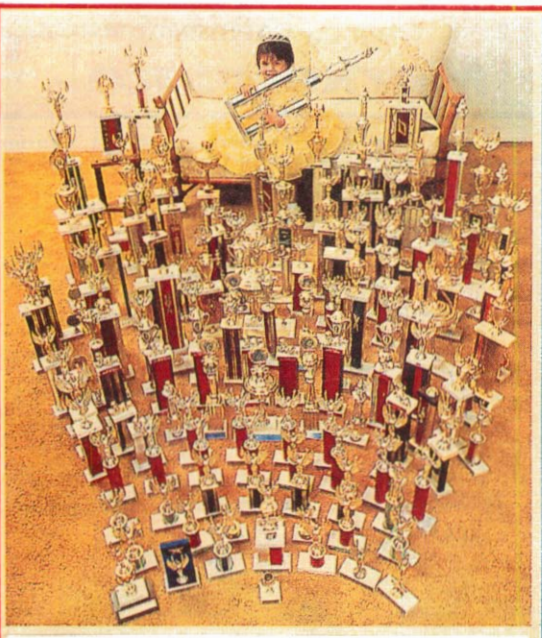

یہ عمر یہ کمال!

۳ر سال کی عمر اور ۱۴۵ر انعامات

بچے کِسے اچھے نہیں لگتے! لیکن سُڑ سُڑ کرکے بہتی ہوئی ناکوں والے، اُلجھے اُلجھے بالوں، گندے گندے گالوں اور پِٹ پِٹ بہتی رالوں والے بچّے والدین کے علاوہ شاید ہی کسی اور کو پسند آتے ہوں۔ اس کے برعکس صحت مند، صاف سُتھرے کپڑوں والے، اُجلے اُجلے جسموں والے، ہنستے مُسکراتے بچّے راہ چلتے انجان لوگوں کو بھی اپنی جانب دیکھ کر مُسکرانے بلکہ گود میں اُٹھا کر پیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آمینڈا اسیوریڈز ایسے ہی بچّوں میں سے ایک ہے۔ امینڈا اپنے امّی ابّو کی عمدہ دیکھ بھال کے باعث ہمیشہ تندرست و توانا رہتی ہے۔ اپنی قابلِ رشک صحت، معمولی مگر صاف سُتھرے اور خوش سلیقہ لباس کی بدولت امینڈا خوبصورت اور صحت مند بچّوں کے مقابلوں میں شرکت کرکے اب تک ایک سو پینتالیس انعامات حاصل کر چکی ہے۔ یہ بچّی پانچ ماہ کی عمر سے ان مقابلوں میں شرکت کر رہی ہے۔ اس وقت اس کی عُمر صرف تین سال ہے۔ ایک سو پینتالیس مقابلوں میں شریک ہو کر امینڈا نے اب تک چالیس مرتبہ اوّل انعام حاصل کیا ہے۔ کیا آپ بھی امینڈا جیسے ہیں؟ ... پوچھنے میں کیا حرج ہے؟

دریائی گھوڑے کی بالائی تصویر فرانس کے شہر بورڈیکس کے پیک نوم سے حاصل کی گئی ہے، جبکہ نیچے کی تصویر سنگاپور کے چڑیا گھر کی ہے۔

دریائی گھوڑا

دریائی گھوڑا جسے بہت سے لوگ دریائی شیر بھی کہتے ہیں، برِاعظم افریقہ کا جانور ہے۔ قدوقامت کے اعتبار سے یہ ہاتھی کے بعد تقریباً سب سے بڑا جانور ہے۔ دریا اور جھیلیں اس کا مسکن ہیں، غالباً اسی لیے دریائے نیل کے بالائی حصّوں اور جنوبی افریقہ کی جھیلوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

موٹی کھال، مضبوط جسم اور چھوٹی ٹانگوں والے اس جانور کی رنگت سیاہی مائل یا سُرمئی ہوتی ہے اور اس کے جسم پر بال بالکل نہیں ہوتے۔ اس کے نتھنے اور آنکھیں چونکہ باہر کو نکلی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے پانی میں بہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں اور نتھنے پانی سے باہر رہتے ہیں۔ دریائی گھوڑے کی لمبائی عموماً ۴ء۶ میٹر یا تقریباً ۱۵ر فٹ تک ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی اونچائی بھی عموماً ۵ر فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس کا وزن تین سے ۵ر ٹن تک ہوتا ہے۔ دریائی گھوڑے کا منہ بہت بڑا اور دانت خاصے قیمتی ہوتے ہیں۔

یہ جانور جھُنڈ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اپنی خوراک کی تلاش میں رات کو نکلتا ہے۔ یہ سبزیاں اور بعض اوقات کسی قریبی کھیت میں گھُس کر فصلیں بھی کھا جاتا ہے۔ پانی میں یہ وزنی ہونے کے باوجود نہایت تیزی سے تیرتا ہے، زمین پر بھی یہ تیزی سے دوڑتا ہے۔ اس کی آواز بھاری ہوتی ہے۔ جو غُرّاہٹ سے ملتی جُلتی ہے۔ اس کا بچّہ آٹھ ماہ میں پیدا ہوتا ہے۔ بچّہ پانی میں عموماً اپنی ماں کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا ہے۔

دریائی گھوڑا عموماً حملہ کرنے میں پہل نہیں کرتا مگر بعض اوقات چھوٹی موٹی کشتیوں پر اچانک بھی حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنے جبڑے سے کشتی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مقامی لوگ اس کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے دانت نہایت قیمتی ہوتے ہیں۔

دریائی گھوڑے کی ایک اور قسم بھی ہے جو قد میں نہایت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ صرف ڈیڑھ میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ یہ بھی نم جگہوں یا پانی کے قریب جوڑوں کی شکل میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

پودوں کے متعلق
تازہ ترین تحقیق
حیران کن
انکشافات

آہستہ بولیے! پودے سُن رہے ہیں

شین فاروقی

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح پودے چل پھر نہیں سکتے یا باتیں نہیں کر سکتے اسی طرح ان میں احساسات بھی نہیں پائے جاتے۔ اسی لیے پودوں کے بارے میں عام رائے ہے کہ بیرونی دنیا سے ان کا تعلق ایسا نہیں ہوتا جیسا ہم لوگوں کا ہوتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ جدید سائنسی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ پودے سورج اور کششِ ثقل کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی پودے کو اندھیرے کونے میں رکھ دیں تو چند ہی گھنٹوں بعد وہ روشنی کی طرف جھکنے لگے گا۔ اسی طرح جب کسی بیج کو زمین میں بویا جاتا ہے تو اس میں موجود جڑوں کو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کس طرح زیرِ زمین اُترنا ہے۔ اسی طرح اُس کے اُوپر کے حصّے کو پتہ ہوتا ہے کہ اُسے کس طرح اُوپر نکلنا ہے۔ پودے کو یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ وہ کششِ ثقل کے اصول سے واقف ہے۔

پودوں پر تحقیق کرنے والے لوگوں کے مطابق پودوں کے اندر ہلکی سی برقی رَو پائی جاتی ہے۔ اس برقی رَو کو ماہرین GALVANOMETER کی مدد سے ناپتے ہیں۔ پودے کی برقی رَو کو ناپنے کے لیے سائنس داں اس آلے کو پودے کے کسی پتّے سے متصل کر کے پتّے میں رونما ہونے والی برقی تبدیلیوں کو نوٹ کرتے ہیں۔ انسانوں کے اندر بھی اسی قسم کی برقی رَو پائی جاتی ہے۔ انسان جب پریشان یا نروس ہوتا ہے تو اس برقی رَو میں تغیّر واقع ہوتا ہے۔

بیکسٹر نام کے ایک آدمی نے CALVANOMETER کی مدد سے کئی برسوں تک پودوں کے رویّوں پر تحقیق کی۔ تحقیق کے نتیجہ میں جو حقائق سامنے آئے وہ بڑے حیران کُن ہیں۔ بیکسٹر نے پودوں کے اندرونی

رویّوں پر تجربے کے لیے۔ ایک کمرے میں دو گملوں میں دو مختلف پودے رکھے اور پھر اُن میں سے ایک پودے کی پتّیاں نوچ کر پھینک دیں۔ ایسا کرنے کے بعد اُس نے درُست حالت میں موجود پودے کو GALVANOMETER سے چیک کیا تو معلوم ہُوا کہ اُس پودے کی برقی رَو میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس پودے کو دوسرے پودے کی پتّیاں نوچے جانے پر دُکھ ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب بیکسٹر نے پودے کی پتّیاں نہیں نوچی تھیں یعنی نوچنے کے بارے میں سوچا تھا اُس وقت بھی دوسرے پودے نے اُس کے ارادے کو بھانپ کر ایسے اشارے کیے تھے جن سے اُس کے دُکھ بھرے ردِّعمل کا اظہار ہو رہا تھا۔ پودوں پر بیکسٹر کی مزید تحقیق سے ثابت ہُوا کہ پودے نہ صرف یہ کہ اپنے ہم جنس پودوں کی تکلیف پر دُکھ کا اظہار کرتے ہیں بلکہ کسی بھی زندہ چیز کی تکلیف ان کے لیے رنج کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً جب بیکسٹر نے پودوں کے سامنے ایک مکھی کو مارا تو اس وقت بھی پودوں نے دُکھ محسوس ہونے کے اشارے کیے۔ حتیٰ کہ جب اُس نے وہی مکھی کھائی تو اس وقت بھی پودوں نے ایسے ہی ردِّعمل کا اظہار کیا۔ پودے نہ صرف یہ کہ اپنے سامنے موجود پودوں کی تکلیف سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ اگر کمرے سے باہر بھی کوئی شخص پودے کو نقصان پہنچا کر اندر آئے تو انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص باہر کسی پودے کو نقصان پہنچا کر آرہا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی ایسا شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے پودے مخصوص اشارے کرنے لگتے ہیں۔

بیکسٹر کی طرح ساؤدن نام کے ایک اور شخص نے پودوں کے رویّوں پر تحقیق کی ہے۔ جس سے پودوں کے رویّوں کے بارے میں مزید حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

پودوں پر تحقیق کے لیے ساؤدن نے گلوانومیٹر کو مستقل طور پر پودوں کے ساتھ منسلک کر دیا اور پھر وقت بہ وقت اُن کے رویّوں کو چیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اگر وہ اپنے آفس سے باہر ہوتا تب بھی وہ ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ پودوں سے خارج ہونے والے اشاروں کے بارے میں معلوم کرتا رہتا۔ اس مستقل تجربے سے انکشاف ہوا کہ پودے صرف اس وقت مخصوص اشارے خارج کرتے ہیں جب وہ بہت خوشی یا غم محسوس کر رہا ہو۔ چاہے وہ پودوں سے کتنے ہی میل کے فاصلے پر کیوں نہ ہو۔ آپ سمجھے ایسا کیوں ہے؟ ایسا دراصل اس لیے ہے کہ یہ پودے ساؤدن سے شدید قربت محسوس کرتے ہیں۔ اسی قربت کے باعث ساؤدن کئی میل دُور سے صرف ان پودوں کے بارے میں سوچ کر ان کی برقی رَو میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ پودوں پر اثر انداز ہونے کی اپنی صلاحیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ... ساؤدن نے پودوں کی برقی رَو کو تعمیری کاموں میں استعمال کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ پودوں کی برقی رَو کو کار کے گیراج کا دروازہ کھولنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے وہ پودوں سے یہ توقع کرے گا اور پودے اس خواہش کو محسوس کرتے ہوئے برقی رَو کو گیراج کا دروازہ

کھونے کے لیے خارج کر دیں گے۔

الیکٹرونک کے ایک جاپانی ڈاکٹر ہاشی موٹو کا کہنا ہے کہ اُس کے پودے گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ایک آلہ بنایا ہے، جو پودوں کی برقی رَو کو آوازوں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس آلے کی مدد سے مختلف واقعات کے رونما ہونے کے وقت مختلف آوازیں سُنی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب پودوں کو پانی دیا گیا یا اُنھیں کسی نئے مقام پر منتقل کیا گیا تو پودوں سے مختلف قسم کی آوازیں خارج ہوئیں۔ ڈاکٹر ہاشی موٹو کی بیوی کا کہنا ہے کہ وہ پودوں سے گفتگو کرتی ہے اور جب وہ پودوں سے کوئی بات کہتی ہے تو پودے مخصوص اشارے کے ذریعہ اُسے جواب دیتے ہیں پودوں کے اِن برقی اشاروں کو ڈاکٹر ہاشی موٹو کے آلے کی مدد سے آوازوں کی صورت میں سُنا جا سکتا ہے۔

پودوں پر تجربات کے دوران پودوں کی انتہائی درجے کی حساسیت کا ایک اور رُخ سامنے آیا اور وہ یہ کہ پودے اپنی خوبصورتی کے بارے میں انسانوں کی طرح کا شعور رکھتے ہیں یعنی اپنی خوبصورتی کی تعریف سے خوش اور بُرائی سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہاشی موٹو کے ایک دوست نے اُن کے کمرے میں رکھے ہوئے دو پودوں میں سے ایک کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کیا خوبصورت پودا ہے، جبکہ دوسرے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا کہ یہ اتنا خوبصورت نہیں ہے تو جس پودے کی کم تعریف کی گئی تھی اُس نے فوراً ایک مخصوص قسم کا اشارہ خارج کیا جو GALVANOMETER پر ظاہر ہوا۔ اس اشارے کے بعد اُس پودے نے پورے دن کسی بھی بات پر کوئی اشارہ خارج نہیں کیا بس سے ظاہر ہُوا کہ وہ پودا اُس شخص کی بات پر ناراض ہو گیا ہے۔ پودوں کی اس حسّاس طبیعت کو دیکھتے ہوئے ہمیں پودوں کے سامنے ذرا احتیاط سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہماری گفتگو کو جتنا ہم سوچتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔

ان حسّاس پودوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں خیال آ رہا ہے کہ جب نباتات اتنے حسّاس ہیں تو اشرف المخلوقات یعنی انسان کس قدر حساس ہو گا! لیکن ہم اپنی روزمرّہ زندگی میں اس کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھتے چنانچہ ہم صبح سے شام تک سینکڑوں بار اپنے جیسے انسانوں کو اُن کی معمولی غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں پر سو طریقوں سے ہر اساں کر کے اُن کے جذبات سے بھرے ہوئے نازک نازک دلوں کو تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ایسا کر کے ایک طرح کی خوشی ایک طرح کا اطمینان بھی محسوس کرتے ہیں۔

ذرا لمحہ بھر کو سوچیئے ہم لوگ کتنے سنگدل اور کتنے بے حس ہیں! گھبرائیے نہیں۔ ممکن ہے آپ ایسے نہ ہوں!

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس:
عبداللہ ہارون روڈ فون: ۵۱۱۷۱۱

شاخیں:

- بہادر آباد فون: ۴۱۳۶۹۵
- ڈیفنس فیز V فون: ۵۲۶۵۳۹
- جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- امیر خسرو روڈ " ۴۱۳۶۹۵
- کھارادر " ۲۲۵۸۰۳
- راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- گارڈن روڈ " ۷۲۲۴۳۳
- حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹
- برنس روڈ ۲۰۲۳۲۶

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس: عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس: صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

اس بار جو دھماکہ ہوا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اُس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ذیشان کو ان دھماکوں نے پریشان کر رکھا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ تخریب کار پکڑے کیوں نہیں جاتے؟ اس کے ابّو آغا صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور پولیس اکیڈمی۔ انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دھماکوں کے سلسلے میں دو تخریب کار گرفتار کیے گئے مگر ان کی رہائی کے لیے سفارشیں آنے لگیں۔ ذیشان اپنے ابّو کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ اُن میں سے ایک بلّی آنکھوں والا اور دوسرا عام سا آدمی تھا۔ اُن دونوں کو بالآخر انسپکٹر احمد نے رہا کر دیا۔ شام کو ذیشان اپنی سائیکل پر جا رہا تھا کہ اُسے بلّی آنکھوں والا کار سے اُترکر جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شخص ایک اسٹور سے "بلیک مین" پرفیوم خرید کر گاڑی میں چلا گیا۔ ذیشان واپس گھر چلا۔ راستے میں اُس کی سائیکل ایک موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی، جس سے وہ دونوں گر گئے۔ گھر پہنچ کر ذیشان کو پتہ چلا کہ اُس کی جیب میں ڈائری نہیں ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اُس کی سائیکل سے ٹکرانے والا آدمی وہی تھا، جسے اُس نے بلّی آنکھوں والے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگلے دن کوئی آدمی ڈائری واپس کر گیا۔ ذیشان فوراً سائیکل لے کر اُس کی تلاش میں نکلا اور بالآخر اُس تک جا پہنچا۔ وہ شخص اُس سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر ذیشان مسلسل خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا۔ اور اُس کا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ کیوں کہ اُن کی باتوں کے دوران ایک جیپ اُن کے پاس آکر رُکی اور دو آدمیوں نے ذیشان کو قابو کر کے اُسے گاڑی میں ڈال دیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اُسے "بلیک مین" خوشبو کا جھونکا محسوس ہُوا۔ آغا صاحب کو ذیشان کی گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری طور پر اُس کی تلاش شروع کروا دی۔ لیکن اُس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے واپس آگیا۔ آغا صاحب اور پولیس کے افسران، اُس سے معلومات کرنے لگے۔ مگر ذیشان کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ وہ اپنے طور پر بھی اُس جگہ کا سُراغ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا، جہاں اُسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی بجی اور نامعلوم شخص نے

دھماکہ

اظہر نیاز

قسط نمبر (۵)

آغا صاحب کو دھمکی دی کہ وہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں، ورنہ خطرناک نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اس کال کے بعد ایسی تمام جگہوں کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا، جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے اگلے دن لاہور کے ایک دینی جلسۂ عام میں بموں کے دھماکے ہوئے اور بہت سے لوگ اور عالمِ دین شہید ہو گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے بازار میں دھماکہ ہو گیا۔ ایک افسر نے شک ظاہر کیا کہ جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں، تخریب کار اُن سے کسی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس بات کا پتا لگانا چاہیے کہ وہ کس طرح میٹنگ کی گفتگو سنتے ہیں۔ ذیشان چھپ کر یہ ساری باتیں سُن رہا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ خود تخریب کاروں کا کھوج لگائے گا۔ اس شک کے بعد کہ مجرم میٹنگ کی کارروائی سُن لیتے ہیں، آغا صاحب کے گھر اور ملازمین کی تلاشی لی گئی، مگر کچھ نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ جدید ترین آلات سے لیس تلاشی پر مامور انسپکٹر شعیب نے شک ظاہر کیا کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس ہے۔ آغا صاحب نے بڑی چالاکی سے ذیشان کی تلاشی لی، مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب نے یہ بات انسپکٹر شعیب کو بتائی تو اُسے شک ہُوا کہ آغا صاحب اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں، تلاشی اُسے خود لینی چاہیے تھی۔

تلاشی لی، مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب کو شک ہُوا کہ ذیشان کہیں تخریب کاروں سے نہ مل گیا ہو۔ ایک دن جب بیماری میں انھوں نے کیپسول کھایا تو یہ مسئلہ فوری طور پر حل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ ذیشان کے جسم میں بھی اسی طرح کا کوئی مائیکرو ٹرانسمیٹر کیپسول چھپایا گیا ہے، جس سے وہ لاعلم ہے۔ خصوصی آلے کی مدد سے چیک کرنے پر یہ شک درست ثابت ہُوا۔ اُس کے بعد آغا صاحب نے میٹنگ کی جگہ بدل دی اور خصوصی کمیٹی کو ایک گرینڈ پلان تیار کرنے کی ہدایت کی۔ ذیشان اپنے دوست طارق کے گھر میں کھیل رہا تھا کہ اُس کے نام کال آئی اور نامعلوم شخص نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اپنے باپ کی زندگی چاہتے ہو تو گرینڈ پلان والی فائل کی فوٹو کاپی بنوا کر ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تمہارے باپ کو بم سے اُڑا دیا جائے گا۔ ذیشان اپنے ابّو کی جان کے بدلے اس کام پر رضامند ہو گیا اور فائل چُرا کر گھر سے قریب ترین فوٹو اسٹیٹ کی دُکان پر پہنچا۔ ابھی فائل کی فوٹو کاپی بن رہی تھی کہ دُکان میں بلیک مین خوشبو کا جھونکا آیا اور بلّی آنکھوں والا بھیڑیا نما آدمی اندر داخل ہُوا۔ فائل کی ساری نقول اُس نے خود لے لیں اور بل ادا کر کے سُرخ پجیرو میں بیٹھ کر چلا گیا۔ ذیشان گھر واپس آیا اور فائل دوبارہ اپنی جگہ رکھ دی۔ اگلے دن وہ طارق کو لے کر اُس علاقے کی تلاش میں نکلا، جہاں اُسے اغوا کر کے رکھا گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ اُسے ایک بنگلے تک وہی سُرخ پجیرو گاڑی نظر آئی۔ اُس نے تخریب کاروں کے اڈّے کا پتہ چلا لیا تھا!

اب آگے ملاحظہ کیجیے

ٹیلی وژن کی خبروں میں بموں کے دھماکوں کی خبریں ایک مرتبہ پھر اہم جگہ حاصل کر رہی تھیں۔ آدھے سے زیادہ خبرنامہ بموں کے دھماکوں، چیخ و پکار، لاشوں اور خون خرابے سے بھرا ہوا تھا۔

ذیشان کو محسوس ہو رہا تھا کہ ٹیلی وژن اسکرین انسانی خون سے نہا گیا ہے اور ابھی خون ٹیلی وژن سیٹ سے باہر کارپٹ پر گرنے لگے گا۔

ذیشان کے ابّو ابھی تک گھر نہیں آئے تھے اس نے کئی بار سوچا کہ ابّو کو ٹیلی فون کرے لیکن اس کے بولنے پر پابندی تھی وہ انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دفتر سے فون آیا کہ آغا صاحب آج گھر نہیں آئیں گے۔

ذیشان کو جلدی تھی کہ کسی طرح وہ جلد از جلد آغا صاحب کو فائل کے بارے میں بتا دے کہیں ایسا نہ ہو کہ فائل کے پلان پر عمل درآمد کرتے ہوئے کوئی ایکشن لیں اور خود کسی مصیبت میں پھنس جائیں ذیشان ساری رات اسی پریشانی کے عالم میں سو نہ سکا۔ صبح کہیں جا کر اُس کی آنکھ لگی۔ ذیشان کی امّی نے جب صبح کی نماز کے وقت اُٹھایا تو اُس نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ کیا ابّو آگئے لیکن اس کی امّی کا جواب نفی میں تھا۔

ذیشان نے نماز پڑھی اور اپنے ابّو کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ٹیلی فون پر ذیشان کے گھر میں اطلاع ملی کہ آغا صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا گیا ہے کیونکہ ایک بہت اہم فائل کی فوٹو اسٹیٹ انھوں نے تخریب کاروں کے حوالے کر دی تھی۔

ذیشان کی امّی صرف روئے جا رہی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آغا صاحب ملک سے غدّاری کا بھی سوچ سکتے ہیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ذیشان ساری صورتِ حال سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنی امّی سے اجازت لی اور آغا صاحب سے ملنے کے لیے جیل چلا گیا۔

جیل کے تقریباً تمام حکّام آغا صاحب کی شخصیت اور خدمات کے معترف تھے اور اکثر تو ان کے شاگرد تھے۔ ذیشان نے اپنا تعارف کرایا تو فوراً ہی اُسے آغا صاحب کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ آغا صاحب جیل کی ایک صاف ستھری کوٹھڑی میں موجود تھے لیکن نہایت پریشان تھے۔ ان کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں جیسے کئی راتوں سے جاگ رہے ہوں۔ ذیشان نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر کاغذ قلم نکال کر ساری تفصیل سے آغا صاحب کو آگاہ کر دیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ سے ہوا ہے اور اُسے شرمندگی ہے۔ آغا صاحب نے کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں تم گھر جا کر آرام کرو۔ تم نے جو فائل تخریب کاروں کے حوالے کی ہے اس کا تو پولیس والوں کو پتہ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو کسی اور چکّر میں پھنسایا گیا ہے۔ تم گھر جا کر اپنی امّی کو تسلّی دو۔ اور گھر سے باہر نہ نکلو میں نے وکیل صاحب سے بات کر لی ہے۔ شام تک ضمانت پر گھر پہنچ جاؤں گا"۔ آتے وقت آغا صاحب نے پھر ذیشان سے کہا۔ "تم کسی صورت میں بھی گھر سے باہر مت نکلو۔ میں صورتِ حال کو سنبھال لوں گا"۔

اتنے میں آغا صاحب کے وکیل صاحب بھی پہنچ گئے اور آغا صاحب نے ذیشان کو اشارہ کیا کہ وہ جائے۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔ وکیل صاحب نے آغا صاحب سے کہا۔ "آپ مجھے اصل صورتِ حال حرف بہ حرف بتائیں تاکہ میں اسی طرح سے کیس تیار کر سکوں"۔ آغا صاحب نے کہا "مجھے پتہ چلا تھا کہ انسپکٹر احمد تخریب کاروں سے ملا ہوا ہے یا کسی مجبوری کے تحت ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں انسپکٹر احمد کے خلاف کوئی کارروائی کرتا۔ انسپکٹر احمد کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس نے تخریب کاروں سے مل کر میرے خلاف سازش کی اور ایک جعلی فائل کی فوٹو سٹیٹ تیار کی۔ اور ایک گواہ بنا لیا کہ ایک مقابلے کے دوران ایک کوٹھی سے یہ فائل اور یہ تخریب کار ملا ہے اور اس نے میرے خلاف گواہی دے دی کہ یہ فائل میں نے اس کے حوالے کی تھی۔ اس طرح اس وقت جب ایوان صدر میں میٹنگ ہو رہی تھی مجھے میٹنگ سے اُٹھا دیا گیا اور ایوان صدر سے باہر نکلتے ہی مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ فائل کی فوٹو سٹیٹ میں نے دیکھی ہے اس پر میرے دستخط موجود ہیں جو میرے نقلی دستخط ہیں۔ وہ اس فائل کی فوٹو سٹیٹ نہیں ہے جو میرے گھر میں موجود ہے کیونکہ اس پر میرے کچھ نوٹ لکھے ہوئے تھے اور چند جگہوں پر میں نے لائنیں لگا رکھی تھیں انسپکٹر احمد دراصل اس کمیٹی میں شامل تھا جو گرینڈ پلان تیار کر رہی تھی اور اُس نے آخری فائل میرے حوالے کرنے سے پہلے اس کی فوٹو سٹیٹ اپنے پاس رکھ لی اور پھر اس پر اِدھر اُدھر لائنیں

لگا کر اور میرے دستخط کر کے میری فائل کی فوٹو اسٹیٹ ظاہر کر دی۔"

"پھر تو یہ بہت ہی آسان کیس ہو گیا۔ اگر آپ کے گھر کی فائل عدالت میں پیش کر دی جائے تو مسئلہ صاف ہو جائے گا اور آغا صاحب سوچ رہے تھے کہ اب یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں رہا کیوں کہ میرے برخوردار نے اس فائل کی فوٹو اسٹیٹ بھی ان کے حوالے کر دی ہے تھوڑی بہت گنجائش جو موجود ہے وہ صرف یہ ہے کہ ابھی تک انسپکٹر احمد کو اصل فائل کی چوری کا پتہ نہیں چلا۔

وکیل صاحب نے آغا صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہایت معمولی بات ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے گھر جو فائل ہے میں اس کی فوٹو اسٹیٹ حاصل کر سکوں؟"

آغا صاحب نے کہا: "ہاں آپ میرے گھر چلے جائیں۔ ذیشان کو اس فائل کا پتہ ہے۔ اس سے لے کر آپ فوٹو اسٹیٹ کرا لیں۔"

"رائٹ سر!" وکیل صاحب نے آغا صاحب سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کی ضمانت کی میں جلد کوشش کروں گا شاید آج ہی۔"

وکیل صاحب آغا صاحب سے مل کر سیدھے اُن کے گھر پہنچے۔ ذیشان گھر پر موجود تھا۔ وکیل صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی! میں نے آپ کو ابّو کے پاس دیکھا تھا۔" ذیشان نے پہچانتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ابّو نے کہا ہے کہ فائل کی فوٹو اسٹیٹ مجھے دے دیں تاکہ میں اُن کا کیس لڑ سکوں اور ضمانت کا بندوبست بھی کیا جا سکے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ذیشان کو اس فائل کا پتہ ہے۔"

"ہاں! مجھے پتہ ہے۔" ذیشان نے وکیل صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہ فائل آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔" ذیشان نے فوراً چابیاں نکالیں لیکن دراز کھولتے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ فائل وہاں موجود نہیں تھی۔ ذیشان ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے فائل یہیں تو رکھی تھی۔

اتنے میں ذیشان کی امّی آغا صاحب کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وکیل صاحب نے اُٹھ کر سلام کیا۔

"میں آغا صاحب کا وکیل ہوں اور ایک فائل لینے کے لیے آیا ہوں۔"

"کیا!" بیگم آغا نے حیران ہو کر کہا: "آپ سے پہلے ایک اور وکیل صاحب آئے تھے۔ اُن کے ساتھ کوئی انسپکٹر صاحب بھی تھے کہ وہ آغا صاحب کے وکیل ہیں اور اُنھیں کوئی ضروری فائل درکار ہے۔ وہ اس دراز سے ایک فائل نکال کر لے گئے ہیں۔"

● بموں کے دھماکوں سے پورا ملک دہل رہا تھا۔ تخریب کار عناصر جلاؤ گھیراؤ اور توڑ پھوڑ میں مصروف تھے۔ لوٹ کھسوٹ ہو رہی تھی۔ بدامنی اور انتشار نے پورے ملک کو گھیر رکھا تھا۔ حکومت کی یقین دہانیوں کے باوجود صورتِ حال قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ روزانہ اعلیٰ سطح کے اجلاس ہوتے لیکن ان کے نتائج سامنے نہ آتے۔

تخریب کار ایک طرف دھماکے کرتے اور دوسری طرف لوگوں کو دُکانیں بند کرنے اور توڑ پھوڑ کرنے پر اُکساتے۔ اس طرح پولیس کی توجّہ ہٹ جاتی۔ اس کی ساری طاقت ملک کا نظم و نسق سنبھالنے میں صرف ہو جاتی اور وہ تخریب کاروں کے تعاقب سے ہٹ کر عوام کو سنبھالنے میں لگ جاتی۔

آغا صاحب کی ابھی تک ضمانت نہیں ہوئی تھی ایک دن ذیشان ان سے ملنے کے لیے آیا تو اس کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا اس نے آتے ہی اخبار آغا صاحب کے آگے رکھ دیا۔

"ابّو یہ دیکھئے وہ خبر جس کا مجھے انتظار تھا۔ تخریب کار پکڑے گئے۔"

"بیٹے! ایسی خبریں اخبارات میں آئے دن آتی رہتی ہیں۔" آغا صاحب نے بڑے اُداس لہجے میں کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ خبر جھوٹی ہے۔" ذیشان نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہے یا سچّی ہے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر طفل تسلّی ہے۔" آغا صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے "بات یہ ہے کہ جس دن ملک میں امن ہو جائے گا کوئی دھماکہ نہیں ہوگا قتل و غارت گری نہیں ہوگی۔ اُس دن ایسی خبر دینے کی ضرورت ہی نہیں آئے گی۔ لوگ خود سمجھ جائیں گے کہ تخریب کاروں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔"

ابھی آغا صاحب اور ذیشان میں گفتگو جاری تھی کہ جمیل صاحب وہاں آ گئے۔ اُنھوں نے آتے ہی پہلے تو ذیشان کو وہاں سے گھر جانے کے لیے کہا اور پھر انھوں نے آغا صاحب کو ایک خبر سُنائی کہ انسپکٹر احمد کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ ڈیوٹی سے واپس اپنے گھر جا رہا تھا۔ جُوں ہی اُس کی جیپ اپنی گلی میں مُڑی اُس پر کلاشنکوف سے حملہ کر دیا گیا۔ اُن کی جیپ سے ایک خط ملا ہے جو کسی بچّے کا لکھا ہوا لگتا ہے اس میں لکھا ہے کہ ہمیں پتہ چل چکا ہے کہ آپ تخریب کاروں سے ملے ہوئے ہیں اب آپ اپنی خیر منائیں۔

دوسرے دن آغا صاحب نے پیغام بھجوا کر ذیشان کو بلوایا اور انسپکٹر احمد کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس کے قتل میں کسی طریقے سے بھی اس کا ہاتھ تو نہیں کیونکہ اس کی جیب سے جو خط ملا ہے وہ ذیشان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ آغا صاحب نے ذیشان سے کہا۔ "مجھے تو پتہ چل چکا ہے کہ وہ تمھارے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے لیکن پولیس خط لکھنے والے کی تلاش میں ہے۔" اُنھوں نے ذیشان کو یہ بھی بتایا کہ بعض پولیس افسران کا خیال ہے کہ لکھنے

والے نے جان بوجھ کر خط ایسا بنایا ہے جیسے کہ کسی بچّے نے لکھا ہو۔

ذیشان نے اقرار کیا کہ خط تو اُسی نے لکھا ہے لیکن اس کے قتل کے بارے میں اس کو کوئی علم نہیں۔ ذیشان نے اپنے ابّو کو لکھ کر یہ بھی بتایا کہ اُس نے اور اس کے دوست طارق نے مل کر شہر کے معزّزین اور حکومت کے اعلیٰ افسران کو خط لکھے تھے کہ انسپکٹر احمد تخریب کاروں سے مل چکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تخریب کار پکڑے نہیں جاتے اور تخریب کاروں کے دشمن کو اس نے جیل میں بند کروا دیا ہے۔

آغا صاحب سوچنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تخریب کاروں نے خود ہی اس کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ کیونکہ اب انسپکٹر احمد ان کے اپنے وجود کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔

آغا صاحب نے لکھ کر ذیشان سے کہا۔ "تم لوگوں نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ پولیس خطوط لکھنے والوں کی تلاش میں ہے اور تمھاری شرارتوں کی وجہ سے کچھ پولیس افسروں کو تم پر شک ہے اور ان کے خیال میں میں نے تمھارے وسیلے سے مل کر کسی کرائے کے قاتل کو حاصل کیا اور انسپکٹر احمد کو مروا دیا۔ کیس میرے خلاف اور اُلجھ گیا ہے کیونکہ میری اور انسپکٹر احمد کی دشمنی تو سب کے سامنے تھی۔"

ذیشان نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"ہوتا تو وہی ہے۔" آغا صاحب نے لکھا۔ "جو اللہ کو منظور ہوتا ہے، لیکن انسان کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے اور جب انسان جانتا ہو کہ وہ بے قصور ہے تو اُسے صرف اپنے اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ سچّائی کے خلاف دُنیا کے تمام جھوٹ بھی اکٹھے ہو جائیں تو بھی جیت نہیں سکتے۔ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔"

ذیشان نے اپنے ابّو کو ایک پرچے پر لکھ کر بتایا۔ "انسپکٹر احمد کے پاس پہلے دن جو ملکی آنکھوں اور سُنہرے بالوں والا غیر ملکی اور ایک عام سا آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ دراصل تخریب کاروں کے اہم آدمی ہیں اور میں ان کا گھر جانتا ہوں وہ سب لوگ سیکٹر زیڈ کے ایک بہت بڑے بنگلے میں جمع ہوتے ہیں۔" ذیشان نے مزید لکھا کہ اس نے اور اس کے دوست طارق نے کئی مرتبہ وہاں چھُپ کر دیکھا ہے۔ کئی مقامی لوگ بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر غیر ملکی ہیں۔ ان کو پیسہ، اسلحہ اور دھماکے کرنے کے لیے بم اور گاڑیاں اُس بنگلے سے فراہم کی جاتی ہیں۔ ابو اور وہ ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔"

آغا صاحب یہ پڑھ کر سکتے میں آ گئے اور ذیشان کو سختی سے لکھا کہ ان کے باہر آنے تک وہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرے گا۔ اور کسی صورت میں بھی وہاں دوبارہ نہیں جائے گا۔

ذیشان نے اپنے ابّو کو یقین دلایا اور اُٹھ کر آ گیا۔

شام کو وکیل صاحب ان سے ملنے آئے تو انھوں نے آتے ہی مبارک باد دی۔

"آغا صاحب مبارک ہو۔ انسپکٹر احمد کے خلاف میرے پاس کافی مواد جمع ہو گیا ہے اور کئی واضح ثبوت اور گواہ موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسپکٹر احمد تخریب کاروں سے ملا ہوا تھا۔ انسپکٹر احمد کے مرتے ہی وہ گواہ بھی مُکر گیا ہے جو انسپکٹر احمد نے آپ کے خلاف پیش کیا تھا کیونکہ اب اُسے اپنی جان کا خطرہ ہے اور وہ بار بار یہی کہتا ہے کہ وہ لوگ مجھے جیل میں بھی مار ڈالیں گے۔ آغا صاحب کل صُبح آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔"

شام ہوتے ہی آغا صاحب کا دل گھبرانے لگا۔ وہ ذیشان کی طرف سے فکر مند تھے۔ انھوں نے جیلر صاحب سے کہا کہ کسی طرح انسپکٹر شعیب سے اس کی ملاقات یا ٹیلی فون پر بات کرا دے۔ گھنٹے بھر بعد انسپکٹر شعیب جیل میں آغا صاحب کی کوٹھڑی میں تھا۔ (باقی آئندہ)

سفر مبارک

معلومات بھی ——— رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

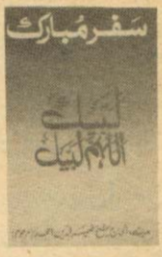

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات

جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف: مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے

صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

○ ہیلو! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شیشہ کس طرح بنتا ہے اور شیشے کی مختصر سی تاریخ بھی بتائیے۔

(صبوحی بانو۔ کوثر ٹاؤن۔ ملیر۔ کراچی)

شیشہ سازی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اٹلی کا شہر وینس صنعتِ شیشہ سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۵۴۷ء میں وہاں ایک قانون بنایا گیا کہ کوئی بھی ہُنرمند مُلک چھوڑ کر نہیں جاسکتا اور نہ ہی کسی دوسری جگہ اپنے اس فن کو دوسروں کے لیے عام کر سکتے ہیں۔ شیشہ بنانے کے لیے ریت، سوڈا چُونے کا پتھر اور دوسرے اجزا کو آپس میں ملا کر بھٹی میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ آپس میں مل کر ایک پگھلی ہوئی حالت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جس کے بعد اُسے مختلف سانچوں اور ہموار شیٹوں میں منتقل کرکے ٹھنڈا کر لیا جاتا ہے۔

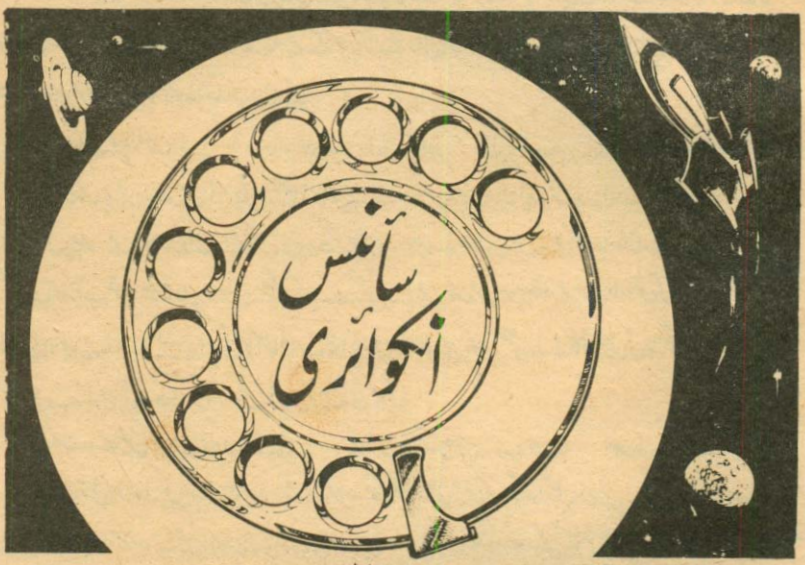

نیّر ابدالی

○ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ ہماری زمین سے نزدیک ترین ستارہ کون سا ہے؟ اور اس کا ہماری زمین سے فاصلہ کتنا ہے؟ (سکندر علی۔ ملتان نورین عتیق۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

بڑی حیرانی کی بات ہے کہ آپ اس ستارے کو نہیں جانتے جبکہ وہ بارہ پندرہ گھنٹے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔ اسے آپ اب تک اُسے نہیں پہچان پائے! بھئی وہ ستارہ سورج ہے۔ جو ہماری زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دُور واقع ہے۔ سورج ہی ہمارے نظامِ شمسی کا مرکز ہے۔ یعنی نو سیارے اپنے اپنے ذیلی چاند کے ہمراہ ایک مخصوص

مدار میں اس کے گرد اپنی اپنی گردش مکمل کر رہے ہیں۔ سورج کے علاوہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ستارے ہیں جو ہمیں رات کو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر وہ ہم سے کروڑوں نوری سال کے فاصلے پر ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا سورج ان کے مقابلے پر ایسا ہے جیسا کہ ستارے ہمیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہماری کائنات بڑی وسیع و عریض ہے۔ ویسے سائنسدانوں نے ایک اندازہ لگایا ہے کہ اگر آپ ایک راکٹ میں بیٹھیں جو مسلسل چلتا رہے تو چاند تک ڈھائی دنوں میں، سورج تک تین ہفتوں میں اور قریب ترین ستارے تک پانچ لاکھ سالوں کے بعد پہنچ جائیں گے۔ اگلا مرحلہ قریب ترین کہکشاں تک پہنچنے کا ہے۔ جو کہ ہماری زمین سے بیس ہزار ملین سال دور ہے۔

○ کاغذ کس طرح بنتا ہے؟ (معظم علی۔ رحیم یارخان)

کاغذ لکڑی اور خصوصاً درختوں کی چھال سے بنایا جاتا ہے۔ خاص طور پر صنوبر کے درخت سے جو گودا نکالا جاتا ہے وہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور کاغذ بنانے کے کام آتا ہے۔ اسی طرح لکڑی کے بیکار ٹکڑے اور پرانے ردی کاغذات سے بھی پیپر ملوں میں دوبارہ کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔

○ زمین کب وجود میں آئی؟ (محمد علی صابر بلوچ۔ گوادر۔ شاہد رحیم۔ ناظم آباد ــــ کراچی)

زمین جس پر ہم رہتے ہیں، اُس کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ سائنس دانوں کے ایک محتاط اندازے کے مطابق ۵۰۰۰ ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی۔ ابتدا میں یہ بہت گرم تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ جلتی ہوئی گیسوں کا مرکب تھی۔ سینکڑوں برسوں کے گزر جانے کے بعد زمین ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی اور اس کی تہہ بننے لگی۔ خشکی اور تری وجود میں آئی۔ زمین پر زندگی کا آغاز کب ہوا؟ اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکی۔ البتہ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ زندگی ۲۵۰۰ ملین سال قبل وجود میں آئی ہوگی۔

○ سمندر سے تیل کس طرح نکالا جاتا ہے؟ (پرنس مبشر علی زیدی ۔ انچولی کراچی)

آج ترقی یافتہ دور میں ہم جن چیزوں کے بغیر گزارے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تیل ان میں سے ایک اہم عنصر ہے۔ چاہے زمین پر یا سمندر میں تیل نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بات کا یقین ہونے پر کہ کسی مقام پر کھدائی کرنے سے تیل نکل آئے گا وہاں کھدائی کی جاتی ہے۔ تیل کی تلاش اور زمین میں اس کی گہرائی معلوم کرنے میں ایک آلہ بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس آلے کو سیسمو گراف کہا جاتا ہے۔ سمندر میں اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا پلیٹ فارم بنایا جاتا ہے جس پر متعلقہ عملہ اور دیگر ساز و سامان ہوتا ہے۔ پھر جب تیل دریافت ہو جاتا ہے تو یہ خالص اور صاف حالت میں نہیں ہوتا بلکہ اس میں دوسرے کئی اجزا بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس تیل کو ریفائنری میں صاف کیا جاتا ہے۔ جس سے پٹرول، پیرافین، بنزائین الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ زمین یا سمندر سے نکالے گئے خام تیل سے پانچ ہزار کے قریب مختلف اشیاء حاصل کی جاتی ہیں۔

○ بادل کس طرح بنتے ہیں؟ (محمد رضوان۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

یہ بات قطعے ہے کہ بادل آسانی سے نہیں بنتے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب سورج کی تیز کرنیں پانی پر پڑتی ہیں تو اس کے بخارات سمندروں، دریاؤں، تالابوں، جھیلوں وغیرہ سے اُڑنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اوپر اُٹھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ فضا میں بلند ہونے پر یہ ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر یا تو مائع کی شکل بارش بن کر یا ٹھوس کی شکل میں برف بن کر زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک دلچسپ سا سائیکل یا چکر بن جاتا ہے۔ جس کے مطابق پانی کی سطح سے بخارات فضا میں جاتے ہیں اور پھر فضا سے بارش یا برفباری کی صورت میں واپس زمین تک آجاتے ہیں۔

○ مجھے جڑی بوٹیوں کے متعلق معلوم کرنا ہے کہ یہ کس طرح استعمال ہوتی ہیں۔

(سونیا حیدر۔ سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی)

جڑی بوٹیاں ہماری روزمرہ زندگی میں ذائقے اور صحت دونوں کے لیے نہایت اہم ہیں۔ نمک، لہسن، ادرک، اجوائن پودینہ، کالی مرچ، تیج پات وغیرہ جڑی بوٹیوں ہی میں شامل ہیں۔ یہ سارے نام آپ روزانہ سنتی ہوں گی۔ کیونکہ کھانوں میں کسی نہ کسی شکل میں ان کی شمولیت لازمی ہے۔ اسی طرح مزید جڑی بوٹیاں حکیم صاحبان مختلف قسم کی دواؤں کی تیاری میں استعمال کرواتے ہیں۔ مسلمان طبیبوں نے جڑی بوٹیوں پر سالوں محنت کرنے کے بعد ان کے خواص معلوم کیے اور مختلف بیماریوں سے بچاؤ کے لیے انھیں بطور دوا استعمال کیا۔ کچھ جڑی بوٹیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے عام آدمی تو انھیں حاصل نہیں کرسکتا۔

○ نکوٹین کیا ہوتا ہے اور اس کے نقصانات کیا ہیں؟ (ناصر علی جان۔ کورنگی۔ کراچی)

بھئی نکوٹین ایک نامیاتی مرکب ہے جو تمباکو میں بالخصوص اس کے پتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نام کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ ۱۵۵۰ء میں پرتگال میں مقیم فرانس کے سفیر ژاں نکوٹ نے تمباکو کا پودا پیرس روانہ کیا۔ بعد میں ۱۵۷۱ء میں خام نکوٹین کا پتا چلا۔ ۱۸۲۸ء میں اس کا خالص مرکب الگ حاصل کیا گیا۔ نکوٹین کا کیمیائی فارمولا یہ ہے $C_{10}H_{14}N_2$۔ جو ۱۸۴۳ء میں معلوم کیا گیا۔ اس سفیر کے نام کی مناسبت سے تمباکو کے پتے میں پائے جانے والے اس نامیاتی مرکب کو نکوٹین کہا جانے لگا۔ یہ ایک زہریلا اور بے رنگ مرکب ہے لیکن تمباکو جب سگریٹ کے لیے کوٹا جاتا ہے تو اس کی بڑی مقدار اس سے نکل جاتی ہے مگر اس کی تھوڑی مقدار باقی رہ جاتی ہے۔ اس وجہ سے سگریٹ نوشی کے بڑے نقصانات ہیں۔ سائنسدانوں نے ایک تجربے کے بعد دیکھا کہ ایک سگریٹ میں اتنا نکوٹین موجود ہوتا ہے جو چار چوہوں کو آسانی سے ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس بات سے سگریٹ نوشی کی ہولناکی کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود نکوٹین کا ایک فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے جراثیم کُش اور کیڑے مار دوائیں بنائی جاتی ہیں۔

دل کی دھڑکن سُنیے

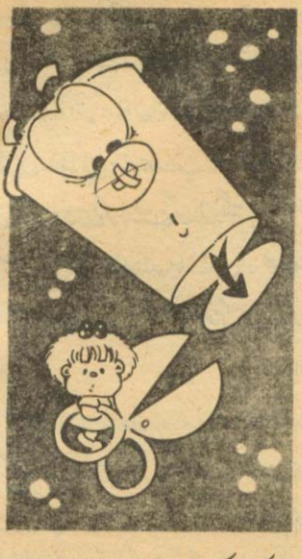

آپ نے ڈاکٹر حضرات کو عموماً اپنے مریضوں کی دل کی دھڑکن سُنتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ یہ آلہ جس سے دل کی دھڑکن سُنی جاتی ہے اسٹیتھ سکوپ کہلاتا ہے۔ آیئے ہم بھی

آپ کو دل کی دھڑکن سُننے کا آلہ بنانا سکھائیں۔ آپ نے کاغذ کے کپ میں آئس کریم تو کھائی ہوگی۔ بس اسی کپ کا پیندا احتیاط سے کاٹ لیں۔ احتیاط اس لیے کہ کہیں آپ کی انگلی نہ کٹ جائے۔ اب اس کپ کے بڑے کھلے ہوئے حصّے کو اپنے دوست کے سینے پر دل کے مقام پر رکھیں۔ اپنے کان کو دوسرے حصّے پر لگائیں۔ اب غور سے دل کی دھڑکن سُنتے رہیے، دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ اب کپ اپنے دوست کے حوالے کر دیں تاکہ وہ بھی آپ کے دل کی دھڑکن سُنے۔ یاں ایک دلچسپ بات یہ کہ انسان کا دل ایک منٹ میں ۷۲ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ ذرا اپنے دوست سے کہیں کہ وہ آپ کی دھڑکنیں گنے اور پھر آپ اس کی دھڑکنیں گنیں۔ اگر دل کی دھڑکن ۷۲ مرتبہ سے زیادہ دھڑکے تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ بچّوں کا دل بڑوں کی نسبت زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ دیکھا آپ ابھی سے آدھے ڈاکٹر تو بن ہی گئے ہیں۔ ہے نا!

سچّی خوشی

محمد سلیم مُغل

سندھ کے پس منظر
میں حقیقی کرداروں پر
مبنی تاثر انگیز کہانی

سب دوستوں کی اٹھنیاں اور چونیاں جمع کرنے کے باوجود بھی جب اتنی رقم جمع نہ ہوئی کہ کرکٹ کا سامان یا ایک بلا ہی خرید لیا جائے تو پھر یہ طے ہوا کہ کھیل کے سامان کو حاصل کرنے کی خواہش ترک کر دی جائے اور اُسی پرانے ڈھب سے کھیل کا آغاز کر دیا جائے۔ اور پھر اگلے روز سے کھیل کا آغاز کر دیا گیا۔

سائیں داد کہیں سے چند اینٹیں لے آیا جنھیں ایک دوسرے پر رکھ کر وکٹ بنایا گیا۔ اور اللہ وسایو اپنے گھر سے کپڑے دھونے والی لکڑی کی ایک "دُھکی" اُٹھا لایا۔ کیوں کہ اس کی شکل بڑی حد تک بیٹ سے مشابہ تھی۔ نیاز محمد نے ٹینس کی ایک پرانی سی گیند کا سُراغ لگا لیا جسے سب بچے "ست ربڑی" بال کہتے تھے۔ یوں گویا کرکٹ کا سامان بھی جمع ہو گیا اور گوٹھ کے پندرہ سولہ بچوں کی ایک ٹیم بھی تیار ہو گئی... مسئلہ باؤنڈری کے تعیّن کا تھا۔ سو اسے غلام حسین نے بڑی ذہانت سے حل کر دیا... میدان کے مغربی حصّے میں نیم کا درخت، مشرق میں ہاریوں کی جھگیاں، شمال میں تالاب کی دیوار اور جنوب میں ادا شفیع محمد کی پرچون کی چھوٹی سی دُکان باؤنڈریز طے پائیں اور پھر قرعے کے ذریعے بیٹنگ کے لیے کھلاڑیوں کی ایک ترتیب بنالی گئی۔ باؤنڈریز کا مسئلہ حل ہوتے ہی سب کھلاڑیوں نے نیفے اُڑس کر اپنی شلواروں کو اُونچا کیا اور میدان میں اُتر گئے۔ کھیل شروع ہو گیا، حاجی محمد عمر کا لڑکا علی گوہر دُور سے ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح بازو گھماتا ہوا آتا مگر قریب آتے ہی بال کو ہاتھ گھما کر پھینکنے کے بجائے پتھر کی طرح دے مارتا۔

گیند چونکہ ربڑ کی تھی اس لیے کوئی نقصان نہ ہوتا ورنہ بعید نہ تھا کہ علی گوہر اب تک پوری ٹیم کو زخمی کر چکا ہوتا۔ دراصل پوری ٹیم میں دھنی بخش، اللہ ڈینو اور نیاز محمد کے علاوہ کسی کو بھی ہاتھ گھما کر بال پھینکنا نہیں آتا تھا۔ اور نیاز محمد تو ہلکی پھلکی لیگ بریک بھی کروالیا کرتا تھا۔ اس لیے نیاز محمد کے سامنے بہت کم کھلاڑی ٹِک کر کھیل سکتے تھے۔

گاؤں کے ان ننھے مُنّے بچّوں کے پاس گو کرکٹ کا سامان نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں سامان کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہوا اور وہ ہر شام یہ کھیل اُسی لگن اور دلچسپی سے کھیلتے جس دلچسپی سے شہروں کے بچّے کھیلتے ہوں گے۔

اُن کی معصومیت اور ان کے سچّے جذبوں نے انھیں کبھی سامان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ شام کو جس وقت سب لوگ کھیل کر واپس جاتے تو ان کے احساسات بھی لارڈز کے میدان میں کھیلنے والے کھلاڑیوں سے کچھ مختلف نہ ہوتے۔

کرکٹ کے یہ ننھے کھلاڑی جس گاؤں میں رہتے تھے، وہ گوٹھ دودو خان کے نام سے مشہور تھا۔ ان کا قریب ترین گاؤں جلال گوٹھ تھا۔ اکثر و بیشتر ان دونوں دیہاتوں کے بچّے آپس میں دس یا پندرہ اوورز کا میچ کھیلتے اور یہ میچ ہمیشہ گوٹھ دودو خان کی ٹیم جیت جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ جلال گوٹھ کے بچّے اچھا نہیں کھیل سکتے تھے بلکہ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ ہمیشہ جیتنے والی ٹیم کا کپتان نیاز محمد بہت اچھا کھیلتا، وہ بولنگ بھی اچھی کرتا اور بیٹنگ بھی۔ اور یوں صرف اکیلے نیاز محمد کا بہترین کھیل ہمیشہ پوری ٹیم کی فتح کا باعث بنتا۔ نیاز محمد کی ٹیم ہمیشہ جیت جاتی اور اس کے عظیم کھلاڑی ہونے کا رُعب سب پر قائم رہتا۔

نیاز محمد صرف اچھا کھلاڑی ہی نہیں اچھا طالب علم بھی تھا اور اُس میں وہ سارے اوصاف موجود تھے جو کسی بھی اچھے بچّے میں ہو سکتے ہیں۔ وہ پورے گوٹھ کی آنکھ کا تارا تھا، سب لوگ اس سے محبت کرتے، اُس کی تعریف کرتے اور اُس کے ہم عُمر ساتھی تو اس کا تذکرہ ایسے کرتے، جیسے وہ کوئی اَنہونی چیز ہے۔ یا اُس کا تعلق کسی اور مخلوق سے ہے۔

چاندنی راتوں میں وڈیرے عبداللہ کی اوطاق پر رات گئے تک کچہری کا سلسلہ جاری رہتا۔ جس میں گاؤں کے بچّے بڑے سبھی جمع ہوتے اور بزرگوں سے اچھی باتیں اور دلچسپ قصّے سُنتے۔ صوفی اللہ بخش گوٹھ کے لوگوں کو وِتائے فقیر کے قصّے اور حکمت و دانائی کی باتیں سُناتا اور لوگ دل ہی دل میں اُس سے بہت مرعوب ہوتے۔ مسجد کے مولوی صاحب شاہ بھٹائی سائیں کے اشعار سناتے تو سمجھنے والے جھوم جھوم اُٹھتے اور کم عُمر یا نہ سمجھ بھی بڑوں کے احترام میں ان کی تقلید کرتے اور سنجیدہ رہتے یا اپنی گردنیں اس طرح گھماتے جیسے یہ اشعار واقعی اُن کی سمجھ میں آ گئے ہوں۔ کاکا اللہ بخش جب ڈھیر سارے لطیفے اور جانوروں کی بولیاں سُنا چکتا تو بچّوں کے ملاکھڑے کا ایک مقابلہ ہوتا۔ اس مقابلے کے دوران گلو منگنہار خوب ڈھول پیٹتا اور ڈھول کی آواز دُور دُور تک سُنی جاتی۔ سب سے آخر میں جب نیاز محمد کو چنگ سُنانے کے لیے بلایا جاتا تو سب سمجھ جاتے کہ یہ کچہری کا آخری آئٹم ہے۔ لوہے سے بنے ہوئے سندھی طرز کے اِس چھوٹے سے آلۂ موسیقی کو جب نیاز محمد اپنے ہونٹوں اور دانتوں کے درمیان رکھ کر اس کے نازک تاروں کو، اپنی پیاری سی اُنگلی سے چھیڑتا تو اس سے موسیقی کے ایسے دلکش جھرنے بہہ نکلتے

کہ سُننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا۔ چنگ کی نازک تار سے نکلنے والی خوب صورت دُھن کے اُتار چڑھاؤ لوگوں کے دلوں میں عجیب مدّ و جزر پیدا کرتے اور ماحول پر عجیب سا سحر طاری ہو جاتا۔ لوگ بُت کی طرح ساکت اور خاموش ہو جاتے اور اُن کی محبت بھری نظریں نیاز محمد کے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں۔ چنگ چونکہ کچہری کا آخری آئیٹم ہوتا اس لیے اس کے ختم ہوتے ہی کچہری بھی ختم ہو جاتی اور لوگ اپنی آنکھوں میں نیند کا خمار لیے، نیاز محمد کی تعریف کرتے اور اُسے دُعائیں دیتے ہوئے گھروں کو چل دیتے۔ سب لوگوں کی زبان سے اپنے بیٹے کی تعریف سُن کر چاچا میر محمد کا سر فخر سے تن جاتا اور وہ اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر نیاز محمد کو پیار کرتے اور دُعائیں دیتے۔

کھیل کُود سے لے کر پڑھنے لکھنے تک نیاز محمد ہر میدان میں نمایاں اور دوسروں سے بہتر تھا۔ مگر جو چیز جنون بن کر اُس کے ذہن پر سوار ہو گئی تھی وہ تھی کرکٹ — کرکٹ کھیلنا اور کرکٹ کے متعلق سوچتے رہنا اُس کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ اُس کی تمام کاپیوں اور کتابوں پر بھی کرکٹ کے نامور کھلاڑیوں کی تصویریں چپکی رہتی تھیں اور اس کے گھر کی دیواروں پر بھی کرکٹرز کے خوب صورت پوز والے رنگین صفحات کے تراشے سجے رہتے تھے۔ ایک روز اس کی بہن حاجرہ نے عمران خان کی تصویر پھاڑ دی تھی۔ اس پر تو وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو گیا اور احتجاجاً کھانا بھی نہیں کھایا... حیرت کی بات یہ تھی کہ کرکٹ کے اس بڑھتے ہوئے جنون کے باوجود پڑھائی سے اس کی دلچسپی پہلے کی طرح برقرار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دو ہی بڑے مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ علی نواز چاچا کی طرح خوب پڑھے اور علم کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرے اور دوسرا یہ کہ وہ کرکٹ کا نامور کھلاڑی بنے... اور پوری دُنیا اُسے عظیم کرکٹر نیاز محمد کے نام سے پہچانے۔

نیاز محمد اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے شہرت کا کوئی شوق نہیں۔ البتہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں کسی بڑے کارنامے کے حوالے سے پہچانا جاؤں۔ میرے ذریعے میرے گوٹھ اور میرے علاقے کو شہرت ملے اور میرے اچھے کام میرے گھر والوں، عزیزوں اور سب گوٹھ والوں کی خوشی اور عزت کا باعث ہوں... بس جس روز میرا بابا اور میری اماں میرے کسی کارنامے سے خوش ہوں گے۔ وہی دن میری سچی خوشی کا دن بھی ہو گا۔

اس مقصد کے لیے نیاز محمد محنت کر رہا تھا۔ تعلیم سے کھیل تک دونوں میدانوں میں اس کی جدوجہد جاری تھی اور اس پوری جدوجہد میں اُس کا آئیڈیل اُس کا چاچا علی نواز تھا... چاچا علی نواز جب دسویں پاس کر کے مزید پڑھنے کے لیے شہر جا رہا تھا تو پورے گاؤں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ مگر اس نے کسی کی ایک نہ مانی تھی اور پڑھنے چلا گیا... پھر اُس نے بڑی محنت سے ایف اے اور بی اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور اب وہ شہر کی بہت بڑی جامعہ میں صحافت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کہنے کو کہہ لیجیے کہ علی نواز، نیاز محمد کا چاچا تھا مگر سچ یہ ہے کہ علی نواز چاچا سے زیادہ دوست تھا... بہت اچھا دوست، بہت شفیق بہت مہربان...

علی نواز چھٹیوں میں گوٹھ آتا تو نیاز محمد کا زیادہ تر وقت اپنے چاچا کے ساتھ گزرتا... نیاز محمد چاچا علی نواز سے شہر کی باتیں سُنتا، شہر کی مزے دار باتیں سُن سُن کر نیاز محمد نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی ایک روز چاچا کے ساتھ شہر جائے گا۔ اور وہاں جا کر چڑیا گھر کی سیر کرے گا۔ اور بڑے بڑے جھولوں میں جھولے گا۔ رکشے میں بیٹھ کر پورا شہر دیکھے گا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ کرکٹ کا سامان خریدے گا۔ بیٹ بال کا سامان، پھر جب وہ پیڈ، گلوز اور اچھے سے بیٹ کے ساتھ میدان میں اُترے گا تو کتنا مزہ آئے گا... کتنی تالیاں بجیں گی... کتنی آنکھیں اس کا استقبال کریں گی...

اس خیال کے آتے ہی اُس نے چاچا سے پوچھا "کیوں چاچا، آپ مجھے شہر لے جائیں گے نا؟"

"ہاں ضرور لے جاؤں گا مگر گرمی کی چھٹیوں میں۔" چاچا نے جواب دیا۔

"اور کرکٹ کا سامان بھی لے کر دیں گے نا چاچا..؟" نیاز نے پوچھا۔

"ضرور لے کر دُوں گا، مگر ایک شرط ہے..."

"کون سی شرط؟" نیاز محمد نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"شرط یہ ہے کہ تمھیں اپنے جیب خرچ سے آدھی رقم بچانا ہوگی اور جب تم سو روپے جمع کر لو گے تو میں تمھیں ایک سو روپے دوں گا۔ اس طرح تمھارے پاس دو سو روپے ہو جائیں گے۔ جس سے کرکٹ کا سامان بآسانی آجائے گا۔"

"دیری گڈ چاچا۔" نیاز محمد خوشی سے کھل اُٹھا۔

"چاچا زندہ باد، چاچا زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

تو گویا اب کرکٹ کا سامان بھی آجائے گا اور میں شہر کی سیر بھی کر لوں گا۔ نیاز محمد نے بے یقینی کے عالم میں اپنے آپ کو یقین دلایا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گلک بھی آگئی اور پیسے بھی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اُسے آٹھ آنے روزانہ جیب خرچ کے ملتے جس میں سے وہ چار آنے خرچ کر لیتا اور چار آنے گلک میں ڈال دیتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتا اور پورے آٹھ آنے گلک میں ڈال دیتا۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آیا جب گلک بالکل بھر گئی اور اس میں مزید پیسے ڈالنے کی گنجائش نہ رہی تو اس نے بابا جان اور عاجزہ کے سامنے اپنی گلک کو بڑی زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ گلک ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی اور ڈھیر سارے سکے فرش پر دُور دُور تک بکھر گئے۔ اتنے ڈھیر سارے سکے دھنی بخش نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ آج اتنے پیسوں کو یکجا دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے سارے سکے جمع کیے اور انھیں کمپیوٹر کی رفتار سے گننا شروع کر دیا۔

"پورے ایک سو پانچ روپے۔" نیاز محمد خوشی کے عالم میں چلایا اور پھر پل بھر میں پورے گھر بلکہ اڑوس پڑوس

تک کو خبر ہو گئی کہ نیاز محمد کی گلگ سے سو پانچ روپے نکلے ہیں... اور پھر خوشی صرف ان پیسوں کی نہ تھی بلکہ خوشی تو اس بات کی بھی تھی کہ گرمی کی چھٹیاں بھی ہو چکی ہیں اور چاچا علی نواز بہت جلد اُسے شہر لے کر جائیں گے۔ جہاں نہ صرف اسے سیر و تفریح کرنا تھی بلکہ اُسے کرکٹ کا سامان بھی خریدنا تھا۔ اتنی بہت سی خوشیوں کے یکجا ہونے پر وہ پھُولے نہیں سما رہا تھا۔

اپنے وعدے کے مطابق چاچا علی نواز نے نیاز محمد کو شہر بُلوایا تو مگر اسے لینے کے لیے وہ خود گاؤں نہ آسکا۔ علی نواز نے اپنی چٹھی میں لکھا تھا کہ "میں بہت مصروف ہوں اس لیے نہیں آسکا۔ نیاز محمد کو کسی شہر آنے والے کے ساتھ بھجوا دیں۔ اور مجھے پیشگی اطلاع دے دیں تاکہ میں نیاز کو لینے اسٹیشن آجاؤں"۔ چاچا علی نواز نے دھنی بخش کو سختی سے ہدایت بھی کی تھی "کہ سفر کے دوران کھڑکی سے مُنہ باہر نہ نکالے اور اپنے سامان پر کڑی نظر رکھے"۔

نیاز محمد نے چاچا کی ساری باتوں کو گرہ سے باندھ لیا اور خود سائیں ہاشم کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہو گیا جو کسی ضروری کام سے شہر جا رہے تھے... سائیں ہاشم نیاز محمد کے اُستاد تھے۔ جنھیں کسی ضروری کام سے شہر جانا پڑ رہا تھا...

یہ تو اور اچھا ہوا... چاچا امیر محمد اور چاچی ٹوکاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سائیں ہاشم کے ساتھ سفر کرنے میں گھر والوں کا بھی اطمینان تھا۔

بالآخر وہ گھڑی بھی آئی جب نیاز محمد چھک چھک کرتی ٹرین میں محوِ سفر تھا۔ اُسے چاچا کی ساری ہدائتیں یاد تھیں اس لیے اس نے کپڑوں کا تھیلا بھی اپنے ساتھ رکھا اور اپنے پیسے بھی شلوار کے نیفے میں چھپا لیے... یہ پیسے اُسے بہت عزیز تھے۔ جو اُس نے چار چار آنے کر کے کئی مہینوں میں جمع کیے تھے۔

ٹرین اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ جھومتی جھامتی ٹرین میں ننھا نیاز محمد بہت جلد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ سوتے ہوئے بھی شہر کے خواب دیکھ رہا تھا، اُس کی ننھی خواہشیں روپ بدل بدل کر آتیں اور وہ خواب کے عالم میں بھی کسی چڑیا گھر کی سیر کر رہا ہوتا۔ اور کبھی دوکاندار سے کرکٹ کا سامان خرید رہا ہوتا۔

بعض ناخوشگوار آوازوں اور تلخ کلامی کے شور سے نیاز محمد کی آنکھ کھُل گئی... ٹکٹ چیکر اور کسی مسافر کے مابین تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ نحیف اور عمر رسیدہ مسافر ٹکٹ چیکر کو یقین دلا رہا تھا کہ اس نے ٹکٹ خریدا تھا مگر وہ نہ جانے کہاں کھو گیا۔ مسافر پریشان تھا اور رہ رہ کر کہہ رہا تھا کہ میں غریب آدمی ہوں اور ۱۰۰ روپے جرمانہ نہیں دے سکتا۔ مجھ پر رحم کرو... مجھے معاف کر دو... سخت گیر ٹکٹ چیکر مغلظات بک رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یا تو جرمانے کے سو روپے ادا کر دو یا پھر پولیس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس غریب کی مدد کرے"۔ نیاز محمد نے سوچا... مگر لوگ بے حسی کی چادر اوڑھ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے، مسافر

کی آہ و زاری اور ٹکٹ چیکر کی دھمکیوں اور گالیوں میں کوئی کمی نہیں...

یہ منظر نیاز محمد کے لیے ناقابلِ برداشت تھا..

'کیا وہ غریب مسافر کی مدد کر سکتا ہے؟' اس نے دل میں سوچا۔

'ہاں!' اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ وہ سو روپے سے اس کی مدد کر سکتا ہے... مگر... مگر وہ کرکٹ کا سامان کیسے آئے گا؟ کیا وہ سو روپے سے اس شخص کی مدد کر دے؟ ان سو روپوں سے جو اُس نے مہینوں کی محنت سے جمع کیے ہیں یہ بڑی مشکل گھڑی تھی... مگر کسی فیصلے تک پہنچنے میں اس نے زیادہ دیر نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ نحیف اور بزرگ مسافر کو دھکے دے کر ٹرین سے اُتار دیا جاتا۔ نیاز محمد نے نیفے میں چھپایا ہوا سو کا نوٹ نکالا اور ٹکٹ چیکر کو دیتے ہوئے کہا: "یہ لو ان کا جرمانہ۔ مگر انھیں ٹرین سے نہ اُتارو۔" اُس کی آواز میں غصہ، دُکھ اور عزم کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے سب مسافر دم بخود تھے نیاز محمد کو دیکھ رہے تھے۔

ٹکٹ چیکر نے سو روپے لیے اور بڑبڑاتے ہوئے رسید بنائی اور آگے بڑھ گیا۔ بزرگ مسافر نے تشکر آمیز جذبات سے مغلوب ہو کر نیاز محمد کو لپٹا لیا۔ سائیں ہاشم نے جو یہ منظر دیکھ رہے تھے اپنی نظریں جھکا لیں۔

ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ نیاز محمد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ابھی تک خوشی کی اس کیفیت کو محسوس کر

رہا تھا، جو اس کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔

ٹرین اسٹیشن پر رُکی... یہ آخری اسٹیشن تھا۔ نیاز محمد کی منزل، چاچا علی نواز اسٹیشن پر موجود تھے۔ سائیں ہاشم نے نیاز محمد کی نیکی کا قصہ چاچا علی نواز کو سُنایا۔ انھوں نے نیاز محمد کو گلے سے لگا لیا۔ اور بہت دیر تک پیار کیا۔ یہ سب کچھ سن کر علی نواز نے بے اختیار محسوس کیا تھا کہ علم کے لمبے سفر میں اب وہ کیلا نہیں ہے۔ اور یہ کتنی خوشی کی بات تھی کہ نیاز محمد نے تو علم کے صحیح مفہوم کو پالیا تھا۔ نیاز محمد کی خوشی کی اس وقت تو کوئی انتہا نہ رہی جب علی نواز چاچا نے بتایا کہ وہ تین سو روپے سے نیاز محمد کے لیے کرکٹ کا بہترین سامان پہلے ہی خرید چکا ہے۔

گرمی کی تعطیلات ختم ہونے کو آئیں۔ آپ نے یہ چھٹیاں یونہی نہیں گزاری ہوں گی۔ بلکہ یقیناً آپ اپنے والدین، بہن بھائیوں یا دوست احباب کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بھی گئے ہوں گے۔ عین ممکن ہے آپ نے سیاحت یا سیر سپاٹے کے بجائے چھٹیاں کسی اور بامقصد کام میں گزاری ہوں۔

آپ نے یہ دن جس طرح بھی گزارے اس کی مختصر روداد ایک مضمون کی صورت میں آنکھ مچولی کے پتے پر ہمیں بھجوائیے۔ آپ کے مضمون کا عنوان ہے۔

"یوں گزاری ہیں چھٹیاں میں نے"

سب سے بہترین مضمون کو آنکھ مچولی کی قریبی اشاعت میں جگہ بھی دی جائے گی۔ اور ایک عدد قیمتی اور خوب صورت انعام بھی۔

تحریر صاف، خوش خط اور کاغذ کے ایک جانب لکھی ہوئی ہو۔

مضمون بھجوانے کی آخری تاریخ ۲۵ اگست ہے۔

(ادارہ)

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھئے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ.... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دوبار دودھ پینا اپنی عادت بنا لیجئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
اشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

MASS

ہوگئی بات صاف

احمد حاطب صدیقی

ماریہ صاحبہ کی اک گڑیا
اور ثوبی کا ایک گڈا تھا
اور دونوں میں چائے پر کل شام
ذکر رشتے کا ایسے ہوتا تھا:

ثوبی :۔ (مُنہ بگاڑ کر)

"ہونہہ! نہ اچھی ہیں عادتیں اس کی
نہ مجھے کوئی خاص لگتی ہے
تم تو کہتی تھیں "گڑیا ہنس مُکھ ہے"
یہ تو بالکل اُداس لگتی ہے!
کب سے بالوں میں کی نہیں کنگھی
چُٹیا دیکھو تو گھاس لگتی ہے
بات کرنے کا اس کو ڈھنگ نہیں
یہ کہیں "ایم اے پاس" لگتی ہے؟
چائے گڈّے کی کوٹ پر ڈھا دی
ایک دم ، بدحواس لگتی ہے
ناں جی ، گڑیا نہیں ہے یہ کمسن
یہ تو گڈّے کی ساس لگتی ہے
اے! ذرا کوک ووک منگواؤ
میرے گڈّے کو پیاس لگتی ہے"
ماریہ صاحبہ کی گڑیا کا....
کھینچا ثوبی نے ایسا جب نقشہ
اُن کو آتا نہ کیوں بھلا غصّہ
پر بڑے ضبط سے یہ فرمایا:

ماریہ :۔ (مُنہ پُھلا کر)

" اے بہن! یہ خوشی کا سودا ہے
ہوگئی بات صاف ، اچھّا ہے
میری گڑیا تو خیر جیسی ہے
لاٹ صاحب یہ خود کہاں کا ہے؟
بھالو جیسی تو اس کی صورت ہے
تم تو کہتی تھیں "بھولا بھالا" ہے
مونچھیں دیکھو تو کتنی موٹی ہیں
سر بھی پیچھے سے تھوڑا گنجا ہے
کہیں افسر تو خیر کیا ہوتا؟
نِفتھ میں فیل ہو کے بھاگا ہے
سب پتا چل گیا مجھے بھی اب
کسی ہوٹل کا یہ تو بیرا ہے
اس کی تنخواہ بس ذرا سی ہے
"ٹِپ" کے ملنے ہی پر گذارا ہے
ہاں اسے کوک بھی منگادیں گے
دیکھ لو کس قدر "نِیتّا" ہے
اس نِکھٹو کو گڑیا دینے سے
کنوئیں میں پھینک دینا اچھّا ہے"

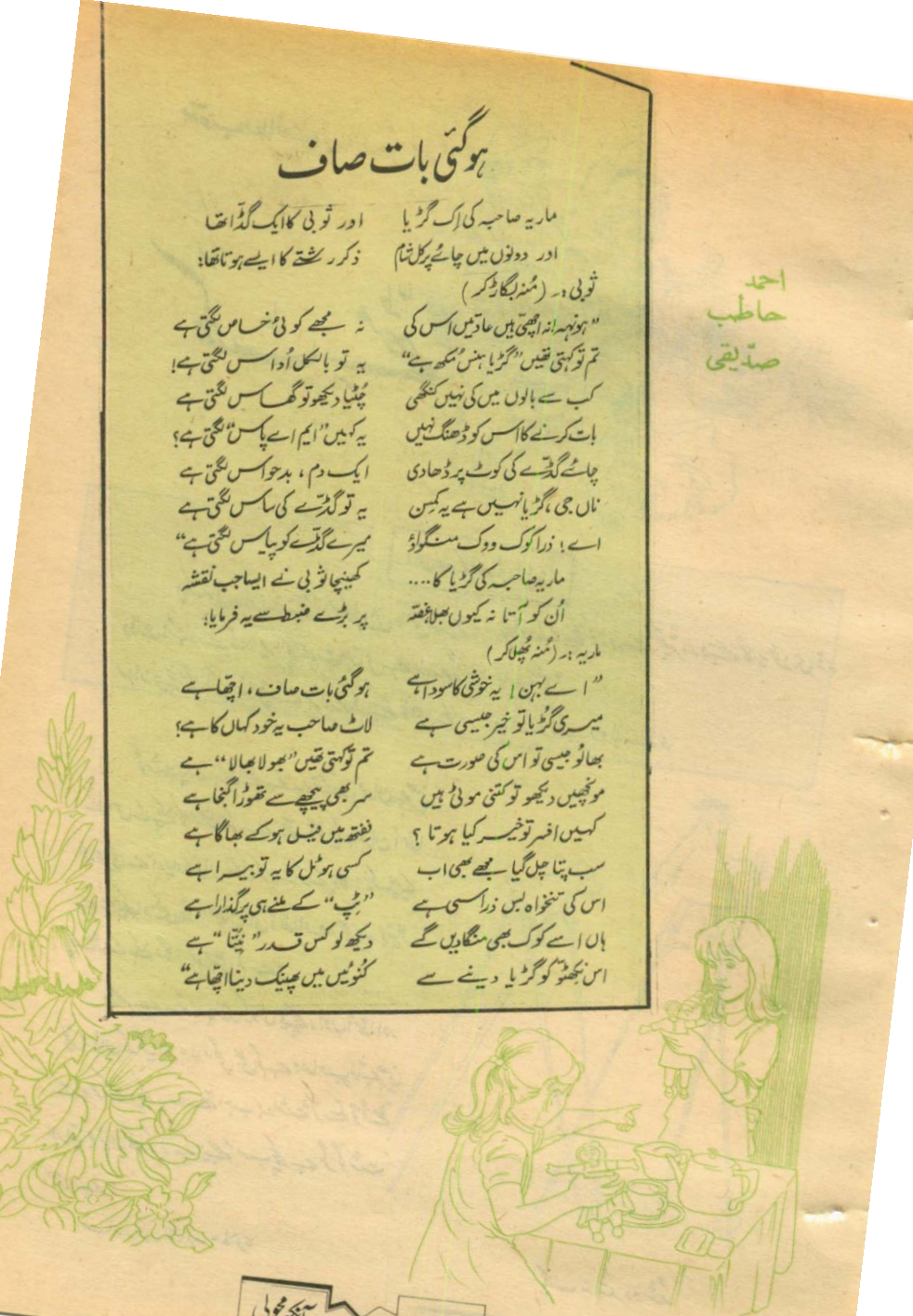

کھٹ مٹھے

اس ماہ کا انعامی لطیفہ

ایک ماں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل کراتے وقت اُستاد سے کہا "میرا بچہ بہت حساس ہے اسے ہرگز سزا نہ دیجئے گا۔ اگر یہ اتفاق سے شرارت کر بیٹھے تو اس کے برابر والے بچے کو زور سے تھپڑ مار دیجئے گا۔ یہ خود ہی ڈر جائے گا۔"

مینا ولی ۔ راولپنڈی

گوشت پک رہا تھا بھوکے بے تکلف مہمان بے چینی سے اس کے پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ایک مہمان اُٹھا اور دیگچی سے دو چار بوٹیاں نکال کر چٹ کر کے بولا "نمک پھیکا ہے" دیکھا دیکھی دُوسرا مہمان بھی اُٹھا اور وہ بھی چند بوٹیاں چٹ کر کے کہنے لگا "مرچ بھی کم ہے"

تیسرے نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں اُٹھا اور کئی بوٹیاں کھا گیا اور بولا "گھی بھی کم ہے" صاحب خانہ بے چینی سے یہ حرکت دیکھ رہے تھے، جب برداشت نہ کر سکے تو اُٹھے اور بقیہ بوٹیاں کھا کر بولے "لیجئے سب کچھ ہے مگر گوشت نہیں ہے"

حامد علی شاہد ۔ لاہور

یک نہ شُد دو شُد

کسی دفتر کے لان میں ردّی کاغذ بوری میں بھر کے جائے جا رہے تھے کہ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کچھ کاغذ اُڑتے ہوئے افسر کی میز پر جا پڑے ایک آدمی دوڑ کر اندر گیا کچھ دیر بعد واپس آیا اور اپنے دوست سے کہنے لگا "ہمارے افسر بڑی تیزی سے کام کرتے ہیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُنھوں نے ان کاغذات پر دستخط کر دیے اور انہیں کلرک کے حوالے کر دیا ہے۔"

عظمیٰ تسنیم، نارتھ ناظم آباد کراچی

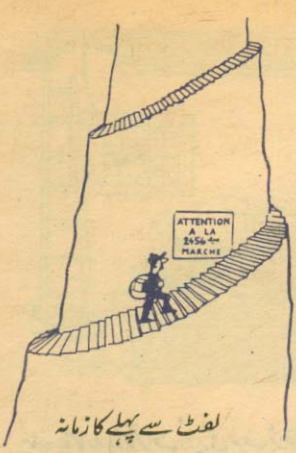

لفٹ سے پہلے کا زمانہ

ایک آدمی قتل کے کیس کے سلسلے میں ایک وکیل سے ملا اور کہا آپ مجھ سے جتنے چاہے پیسے لے لیں، مگر ہمارے آدمی کو پھانسی سے بچا لیں۔ وکیل نے کہا میں تیس ہزار روپے لوں گا وہ آدمی رضامند ہو گیا، فیصلہ ہُوا اور اُس آدمی کو دس سال قید کی سزا ہو گئی، وہ آدمی بہت خوش ہُوا اور وکیل سے پُوچھا آپ نے یہ کام کیسے کیا؟ وکیل نے کہا مجھے اس کام میں بڑی مُشکل پیش آئی۔ اس آدمی نے پوچھا وہ کیسے؟ وکیل نے کہا بڑی مشکل سے جج کو سزا دینے کے لیے راضی کیا وہ تو بَری کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔

شہنشاہ بابر خان، بھاولنگر

ایک ڈاکٹر اور ایک گورکن دوست تھے ایک دن ڈاکٹر نے مذاق میں گورکن سے کہا کہ تم تو یہ دُعا مانگتے ہو گے کہ روز کوئی مرے، گورکن نے جواب دیا نہیں مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ جو مریض تمھارے پاس آتا ہے اُس کی قبر میں پہلے سے بنا لیتا ہوں۔

کاشف نوید خان، ڈیرہ اسماعیل خان

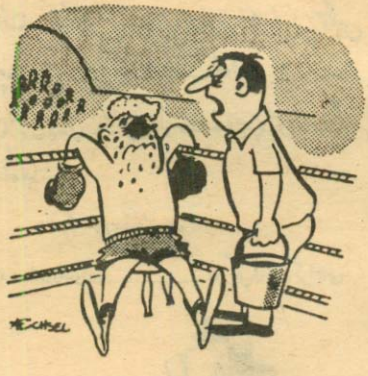

میں واٹر بورڈ کا ملازم نہیں تمہارا ریفری ہوں

نماز کے بعد مسجد کے دروازے پر لوگ جُوتے پہن رہے تھے کہ ایک آدمی نے ڈرتے ڈرتے دوسرے آدمی سے پوچھا "کیا آپ کا نام عطاء الرحمٰن ہے؟"

"جی نہیں میرا نام سلیم ہے۔" دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے اس لیے شک ہُوا کہ آپ عطاء الرحمٰن کا جُوتا پہن رہے ہیں اور اتفاق سے میرا نام عطاء الرحمٰن ہے" پہلے آدمی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

فرحانہ حسین پیرزادہ، رضویہ سوسائٹی کراچی

ہمارے کاروبار کا گراف اُوپر کی طرف بڑھتا جا رہا ہے

ایک نوجوان چاند ہوٹل گیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے دوران اُس نے زور زور سے کھنکارنا شروع کر دیا اور اس کے بعد ناک صاف کرتے ہوئے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔ یہ دیکھ کر ہوٹل کے مینیجر سے نہ رہا گیا وہ اُس کے پاس گیا اور بولا۔

"کیا تمھیں اس سے پہلے کسی اچھے ہوٹل میں جانے کا اتفاق نہیں ہُوا؟"

نوجوان: "ہُوا ہے۔"

مینیجر: "وہاں بھی تم نے یہی حرکتیں کی تھیں؟"

نوجوان: "ہاں"

مینیجر: "تمھاری حرکتوں پر وہاں کی انتظامیہ نے کیا کہا تھا؟"

نوجوان: "انھوں نے کہا تھا کہ اگر ایسی حرکتیں کرنی ہوں تو چاند ہوٹل میں جا کر کیا کرو۔"

محمد راحیل ـــــ ناظم آباد کراچی

ننھا حید رصبح کی نماز کے بعد گڑگڑا کر دُعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ ننکانہ صاحب کو جاپان کا دارالخلافہ بنا دے۔"

امّی نے سُنا تو حیران ہو کر پوچھا۔

"منّے ایسی دعا کیوں مانگ رہے ہو؟"

منّے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "امّی میں پرچے میں یہی لکھ آیا ہوں۔"

محمد اکرم سیال ذکی ـــــ ننکانہ صاحب

ایک بار کلاس میں بچّوں کی شرارت سے تنگ آکر اُستاد نے اُنھیں سیدھے لیٹ کر سائیکل کی طرح ٹانگیں چلانے کی سزا دی۔ ایک لڑکے نے تھوڑی دیر بعد تھک کر ٹانگیں چلانی بند کر دیں۔ اُستاد نے وجہ پوچھی تو شاگرد نے کہا۔

"سر ڈھلوان آگئی ہے۔"

محمد رضوان ـــــ اورنگی ٹاؤن کراچی

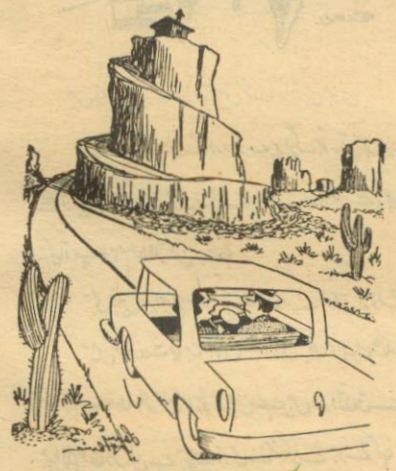

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ....

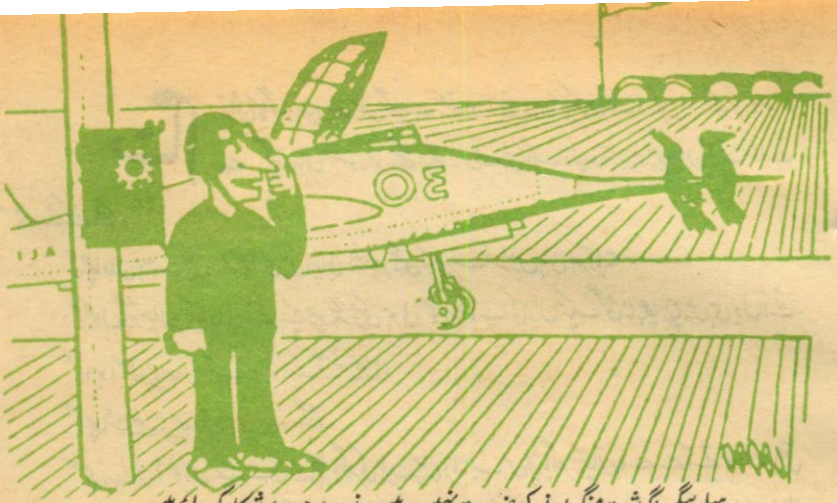

ہیلو بیگم! گوشت منگوانے کی ضرورت نہیں - میں نے دو پرندے شکار کر لیے ہیں

دن کے اختتام پر ڈاکٹر نے اپنے کمپاؤنڈر سے پوچھا:
"آج کلینک میں کتنے مریض فوت ہوئے؟"
کمپاؤنڈر:- "جناب دس"۔
ڈاکٹر:- "مگر میں نے تو گیارہ مریضوں کو دوا دی تھی!"
کمپاؤنڈر:- "جناب ایک مریض نے دوا پینے سے انکار کر دیا تھا"۔

شہلا سیّد ــــــ شاہ فیصل کالونی کراچی

ایک کمپنی جعلی ویزے اور پاسپورٹ بنا کر لوگوں کو دبئی بھیجنے کا جھانسا دے کر اُن سے روپے اینٹھتی اور لوگوں کو کراچی یا لاہور میں اُتار دیتی۔ ایک شخص کو جھانسا دے کر اُنہوں نے کراچی میں اُتار دیا۔ وہ صاحب کراچی میں اُترے تو سڑکوں پر گھومتے ہوئے اُنہیں اندازہ ہُوا کہ یہ دبئی نہیں ہے۔ انہوں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو روک کر پوچھا کہ "کیا یہ دبئی ہے؟" اُس آدمی نے اُسے گھور کر دیکھا اور کہا "یہ دبئی نہیں ہے مسقط ہے"۔

شکیل احمد ــــــ مردان

اُستاد:- (نفی کرنے کے اصول بتاتے ہوئے) "نفی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جنس یکساں اور ایک رقم دوسری رقم سے چھوٹی ہو۔ مثلاً چار کدّوؤں میں سے دو کیلے یا آٹھ سیبوں میں سے تین آم نہیں نکالے جا سکتے"۔
شاگرد:- "مگر جناب دو بھینسوں میں سے پانچ سیر دودھ تو نکال سکتے ہیں"۔

ابنِ مفرح ــــــ مردان

فرانسیسی اُستاد:- (کام چور طالبِ علم سے) "تمہاری عُمر کیا ہے"؟
لڑکا:- "جناب! بارہ سال"۔
اُستاد:- "آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ جب نپولین بارہ سال کا تھا تو اپنی جماعت میں اوّل آتا تھا"۔
شاگرد:- "جناب آپ درُست کہتے ہیں مگر نپولین جب آپ کی عُمر کا تھا تو وہ فرانس کا حکمران بن چکا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی..."

رمضان ماجد ــــــ کوٹ غلام محمّد

نام تو اُن کا گوہر میاں تھا لیکن گھر سے محلے اور محلے سے اسکول تک وہ گپّیں ہانکنے کی وجہ سے گپّو میاں مشہور ہو گئے تھے۔ ایسے ہی ایک دن وہ اپنے چچا جان کو قصّہ سُناتے ہوئے کہنے لگے۔

"چچا جان! جب میں نے گاڑی میں چابی لگتے دیکھی تو میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔"

"کیوں گپّو میاں! کیا چابی کے نیچے چیونگم چپکی ہوئی تھی، جو آپ کی رال ٹپک گئی۔" چچا بیچ میں ہی بول اُٹھے۔

"اوہو! بھئی چچا جان، آپ میری بات تو سُنیں۔"

"اچھا سُنائیں۔" چچا جان سنجیدہ ہو گئے۔

"میں نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور چڑیا گھر کی طرف چل دیا۔ جب میں چڑیا گھر پہنچا تو سامنے سے آتے ہوئے ہاتھی نے سُونڈ اُٹھا کر میرا مُنہ چڑا لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد غصّہ آیا۔ میں نے فوراً گاڑی کے انجن کا ڈھکنا کھول کر جوابی کارروائی

کی۔ ہاتھی شاید میرے انتقام سے جل گیا۔ اور زور سے چنگھاڑا تو میں نے گاڑی کا ہارن پوری طاقت سے بجا دیا۔ اب وہ ہاتھی بہت شرمندہ ہوا۔ اُس نے اپنی پیٹھ پر چھ بچّے بٹھا لیے۔ میں نے گاڑی میں آٹھ بچّے بھر لیے۔ بس اسی بات پر ہاتھی کو غصّہ آگیا۔ اُس نے مجھے اپنی سُونڈ میں لپیٹ کر شیر کے پنجرے کے اُوپر بٹھا دیا۔ شیر نے گھبرا کر دُم جھاڑی اور میری طرف لپکا۔ پھر مجھ سے ڈر کر دیوار سے جا لگا۔ میں نے اُسی وقت اُس کی پیٹھ پر پیر رکھا اور نیچے اُتر آیا۔ شیر میرے پیر چاٹنے لگا۔ میں نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور باہر آگیا۔ ہاتھی نے مجھے صحیح حالت میں باہر آتے دیکھا تو بڑا گھبرایا اور بھاگ کھڑا ہوا میں نے اُس کی دُم پکڑ کر تیزی سے گھمانا شروع کر دیا پھر اُسی قوّت سے چھوڑ دیا۔ ہاتھی دُور تک کسی بم کے گولے کی طرح اُڑتا ہوا گیا اور سامنے لگی انگور کی بیل میں جا پھنسا۔ دو دن تک...؟"

گپّو میاں ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ چچا جان نے ٹوکا۔ "گپّو میاں! مذاق میں بھی جھوٹ بولنا اچھا نہیں۔ اس سے اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔"

"لیکن چچا جان آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ایسا سچ مچ تھوڑا ہی ہوا ہے۔ یہ تو میں گپ سُنا رہا تھا۔" گپّو میاں نے سنجیدہ

ہوئے ہوئے کہا۔

"لیکن گپّو میاں! آپ جو کچھ بھی سُناتے ہیں، غلط کرتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ عادت نہیں چھوڑی تو کسی دن آپ کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ آپ اچھے کام کریں تاکہ لوگ آپ کو گپّو میاں کی بجائے اصل نام سے جانیں۔" لیکن گپّو میاں چچا جان کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اِنھی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ قاضی صاحب کے گھر کچھ چور گھُس آئے اور اس طرح مکان کی صفائی کر گئے کہ قاضی صاحب کے گھر والوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ تقریباً تمام ہی محلے والے جاگ چکے تھے۔ اور ہر کوئی اس چوری پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ پولیس بھی آچکی تھی اور تفتیش جاری تھی۔

چونکہ قاضی صاحب، گپّو میاں کے پڑوسی تھے اور اُن کا بیٹا اسلم گپّو میاں کا دوست بھی تھا اس لیے آصف نے کہا۔ "بھئی اگر اسلم اور اُس کے گھر والوں کو چوروں نے بے ہوش کر دیا تھا اور لوٹ مار میں مصروف تھے تو گپّو میاں کی آنکھ تو کھُل جانی چاہیے تھی۔ یہ تو ہوش میں تھے۔" آصف کا یہ طنز گپّو میاں سے برداشت نہ ہو سکا۔ اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا۔

"ارے کیا بات کرتے ہو تم یقین کرو، میں نے سب چوروں کو دیکھا تھا۔" اُس کی اس بات پر سب کے مُنہ حیرت سے کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ "کیا سچ؟" اکبر نے اُنگلی مُنہ میں دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، تم سُنو تو سہی۔ رات کو اچانک گاڑی کی آواز سُن کر میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو چھ چور

کالے کپڑے اور ڈھاٹے باندھے اسلم کے گھر میں کود رہے تھے۔ اُن کے جسم یوں چمک رہے تھے، جیسے کوجیک کی شفاف کھوپڑی چمکتی ہے۔"

"اُنھوں نے اپنے جسم پر تیل مَل رکھا ہوگا۔ ہماری امّی بتاتی ہیں کہ چور اس لیے تیل مَل کر چوری کرتے ہیں تاکہ لوگ اُنھیں پکڑیں تو وہ اُن کے ہاتھ سے پھسل جائیں۔" آصف چُپ نہ رہ سکا۔

"شاید ایسا ہی ہو، بہرحال اب بیچ میں کوئی نہ بولے ورنہ میں قصّہ نہیں سناؤں گا۔" گپّو میاں نے اُنھیں گویا دھمکی دی۔ سب بچّے خاموش ہو گئے تب گپّو میاں نے دوبارہ قصّہ شروع کیا۔

"دو آدمی گاڑی میں بیٹھے رہے اور باقی چار دل اندر داخل ہوئے۔ اُنھوں نے تمام گھر والوں کو بے ہوش کیا اور پھر تالے توڑ کر ایک چادر میں سامان سمیٹنا شروع کیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان کو پولیس کے ذریعے گرفتار کروا دیا جائے۔ میں نے پہلے اپنے تیر کمان کے ذریعے اُن کی گاڑی کو پنکچر کیا پھر فون کی طرف لپکا، مگر معلوم ہوا کہ فون خراب ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ ابّو کو جگا کر اُنھیں اس صورتِ حال سے باخبر کردوں مگر پھر خیال آیا کہ پہلے میں چوروں کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرلوں مگر گاڑی کا نمبر کس طرح نوٹ کرتا کیوں کہ پنسل تو میں نے کل غسل خانے میں شلوار کی ازاربند ڈالنے کے لیے استعمال کی تھی۔ اور اب پنسل کو وہاں ڈھونڈنا اس لیے مشکل تھا کہ کل رات غسل خانے کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں بھلا یہ کام کیسے ہو سکتا تھا؟ اُسی وقت گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر باہر آیا۔ چور گاڑی کا پہیہ بدل کر جا رہے تھے۔ ویسے میں اُن چوروں کو پہچانتا ہوں۔"

"سر! یہ بچّہ اُن چوروں کو پہچانتا ہے۔" ایک جوشیلی آواز آئی۔ گپّو میاں نے مُڑ کر دیکھا تو اُن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُن کے پیچھے ایک پولیس والا کھڑا تھا، جو اُن کی تمام گفتگو سُن چکا تھا۔

"ن ... ن ... نہیں ... میں تو یُوں ہی گپ ..." گپّو میاں کا جُملہ مکمل نہ ہو سکا۔ پولیس والوں نے اُن کو اُٹھا لیا۔

"تم نے چوروں کو دیکھا بھی ہے اور پہچانتے بھی ہو۔" انسپکٹر نے گپّو میاں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب!" گپّو میاں رونے لگے۔ "آپ مجھ سے قسم لے لیں، میں نے چوروں کی شکل بھی نہیں دیکھی اور شکل تو کیا، میری تو آنکھ بھی نہیں کُھلی تھی۔ میں تو آپ کے بتانے پر اُٹھا ہوں۔ یہ سب کہانی جو میں نے سُنائی ہے، یہ گپ ہے۔ خُدا کے لیے آپ مجھے چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ گپ بازی سے دُور رہوں گا۔" گپّو میاں روتے جاتے تھے اور توبہ کرتے جاتے تھے۔ آخر انسپکٹر کو اُن کی حالت پر رحم آگیا اور اُس نے گپّو میاں کو چھوڑ دیا۔ گپّو میاں نے آزاد ہوتے ہی خُدا کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگے، چچا جان نے دُرست کہا تھا کہ گپ بازی سے مجھے سزا ملے گی۔ اور مل گئی۔ اب میں اس عادت کو چھوڑنے کا عہد کرتا ہوں۔

اس کے بعد واقعی اُنھوں نے اپنی اس عادت سے چھٹکارا پالیا۔ اب لوگ گپّو میاں کو بھول چکے ہیں۔ ہاں ایک شریف اور اچھا سا لڑکا اب بھی وہاں رہتا ہے، جس کا نام گوہر میاں ہے!

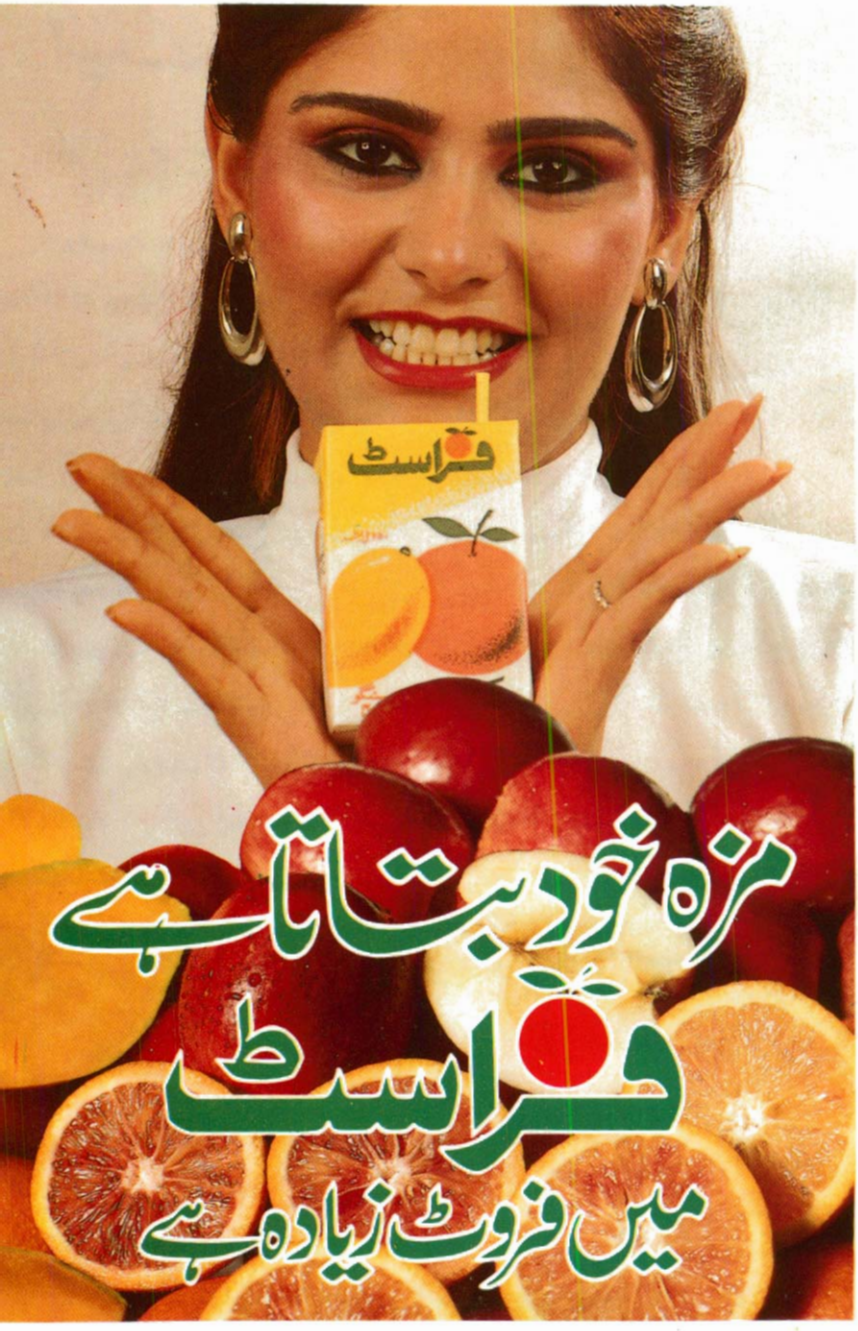
فراسٹ
مزہ خود بتاتا ہے
فراسٹ
میں فروٹ زیادہ ہے

عائشہ سلیم

آپ کے بال بھی کھڑے ہو سکتے ہیں !!

خوف سے رونگٹے کھڑے ہونے کے بہت سے واقعات آپ کے علم میں ہوں گے۔ بلکہ ممکن ہے ابّو کی ڈانٹ، امّی کے چمٹے، ٹیچر کے مولا بخش اور رات کے اندھیرے میں اکیلے پن کے احساس نے آپ کو کئی بار اس تجربے سے براہِ راست دوچار کیا ہو؟ مگر بلا خوف سر کے بالوں کے کھڑے ہو جانے کا واقعہ شاید ہی آپ کی نظر سے گزرا ہو!

حال ہی میں امریکہ کے ایک ماہرِ طبیعیات ڈاکٹر ہیملٹن نے الیکٹرواسٹیٹک جنریٹر کی مدد سے اپنے نو سالہ بچے کرِس کے سر کے بالوں کو کھڑا کرنے کا دلچسپ مظاہرہ کیا ہے۔ اس تصویر میں آپ اس مظاہرے کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ تصویر میں موجود دوسرا بچہ کرِس کا دوست ہے جو اس مظاہرے کو دلچسپی اور حیرت کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔

اس دلچسپ مظاہرہ میں ڈاکٹر ہیملٹن نے جنریٹر کی مدد سے ایٹم کے مثبت چارج کو منفی چارج سے جُدا کر دیا اس عمل کے بعد منفی چارج خود بخود جنریٹر کے گنبد نما حصّے میں جمع ہو گئے۔ جب کرِس نے جنریٹر کے گنبد نما حصّے پر اپنا ہاتھ رکھا تو جمع شدہ منفی چارجز کرِس کے جسم پر سے ہو کر گزرتے گئے۔ سر پر سے ہو کر گزرنے والے انہی منفی چارجز کی بدولت کرِس کے بال

ڈاکٹر ہیملٹن
بال کھڑے کرنے
کے عمل کا مظاہرہ
کرتے ہوئے

کھڑے ہو گئے۔

ان برقی چارجز سے کرس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ کرس برقی رَو کو اپنے اندر جذب کرنے والے آلے پر کھڑا تھا۔ اس تجربے سے ساکن برقی رَو کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہی ساکن برقی رَو ہے جو کپڑوں اور بالوں کو سُکھانے کے کام آتی ہے۔

ڈاکٹر ہیملٹن نے طبیعیات کے بہت سے دوسرے اصولوں کی مدد سے سائنس کے طلبہ کی دلچسپی کے لیے بہت سے سائنسی کھیل ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر طبعیات کا ایک اصول ہے ۔

"اگر جسم کسی بڑے حصّے پر رکھا جائے تو جسم کا وزن تقسیم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اُس حصّہ پر کم دباؤ پڑتا ہے۔"

اگر آپ کسی ایک کانٹے پر کھڑے ہو جائیں تو وہ کانٹا آپ کے پاؤں میں گُھس جائے گا لیکن اگر آپ قریب قریب ایک جیسے فاصلے سے لگے ہوئے سینکڑوں کانٹوں پر لیٹیں گے تو آپ کے جسم کا وزن تقسیم ہو جائے گا اور کسی کانٹے پر زیادہ دباؤ نہیں پڑے گا۔ جس کے نتیجے میں کوئی کانٹا آپ کے جسم میں نہیں گُھسے گا۔

ڈاکٹر ہیملٹن اسی اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے اکثر کانٹوں کے بستر پر لیٹنے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیملٹن کے یہ کھیل بچّوں میں بے حد مقبول ہیں۔ ان کھیلوں کی مدد سے جہاں بچّوں کو تفریح میسّر آتی ہے وہیں وہ کھیل کھیل میں طبیعیات کے بہت سے بنیادی اصولوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔

کاش ہمارے پیارے مُلک میں بھی ڈاکٹر ہیملٹن کی طرح کے دو چار لوگ پیدا ہو جائیں! کم از کم ہم دُعا تو کر ہی سکتے ہیں نا!

دو ملکوں میں زبردست جنگ جاری تھی، ایک ملک کے ملٹری کمانڈر نے یہ اعلان کیا کہ جو فوجی جوان ہمارے مخالف ملک کا ایک ٹینک اپنے ملک کی سرزمین میں لے آئے گا، اسے دو سال کی چھٹی اور پانچ ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ اعلان کے اگلے روز ایک فوجی جوان، دشمن ملک کا ایک ٹینک اپنے ملک لے آیا۔ افسروں نے اس کے کارنامے کو بہت سراہا۔ اگلے روز وہی جوان پھر ایک ٹینک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے میں پانچ ٹینک لے آیا۔

جنگ ختم ہوئی تو انعامات کی تقسیم شروع ہوئی۔ سب سے پہلے اس فوجی جوان کو اسٹیج پر بلوایا گیا۔ اور اس کے تاثرات دریافت کئے گئے۔ وہ کہنے لگا "جناب! جس شرط کا اعلان اپنے ملک میں ہوا تھا اسی قسم کا اعلان دشمن ملک میں بھی ہوا تھا۔ لہٰذا میں انہیں اپنے ملک کا ٹینک دے کر ان کا ٹینک یہاں لے آتا تھا۔"

محمد رفیع ـــــ گاؤں کوئیاں

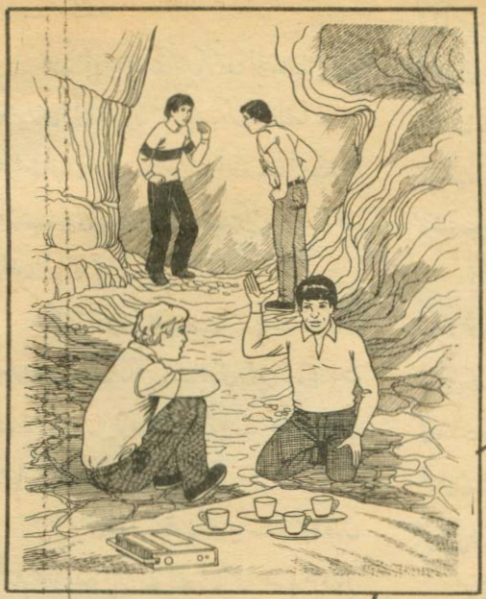

حق اسکواڈ
کی نئی مہم

قسط نمبر ۱

عنکبوت وڈیو سنٹر

اخلاق احمد

ایک طویل عرصے سے وہ غار خالی پڑا تھا۔
"حق اسکواڈ" کا ہیڈ کوارٹر۔ کئی ہفتوں سے وہاں کوئی آیا تھا، نہ گیا تھا۔
یہ اسکول کی چھٹیوں کے مہینے تھے۔ حق اسکواڈ کے چاروں ارکان شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ہر سال ان کے والدین اسکول کی چھٹیوں کے زمانے میں انھیں تفریح کے لیے کسی دوسرے شہر لے جاتے تھے۔ بالآخر چھٹیاں ختم ہوئیں۔

اور اس کے ساتھ ہی حق اسکواڈ کے ہیڈ کوارٹر کی ویرانی بھی ختم ہوگئی۔

وہ چاروں ایک شام اپنے غار نما ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ اُن کی آوازیں، اُن کے قہقہے ہر جانب گونجنے لگے۔ ذرا سی دیر میں اُنھوں نے پورے غار کو صاف کر ڈالا۔ پہلے گرد جھاڑی گئی۔ پھر فرش کو دھویا گیا، صاف دری بچھائی گئی، برتن دھوئے گئے، چولہا جلنے لگا، پانی اُبلنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ سب غار کی دیواروں سے ٹیک لگائے، اطمینان سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری تھی۔

"میں تو لاہور کو دیکھ کر حیران رہ گیا بھائی۔" سرفراز کہہ رہا تھا۔ "اتنے بڑے بڑے پارک، اور وہ جو لیس کورس پارک ہے وہاں۔ وہاں پر سارے فوارے کمپیوٹر سے چلتے ہیں۔ ان سے اُچھلنے والا پانی ایسے ایسے ڈیزائن بناتا ہے کہ بس۔"

"چھوڑو یار۔" شہزاد نے کہا۔ "طورخم دیکھا ہے کبھی۔ جہاں پاکستان اور افغانستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ شہتوت کے درخت ہیں وہاں۔ بے شمار۔ سڑک پر ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ اس زنجیر کے ایک طرف افغانستان، ایک طرف اپنا پیارا پاکستان۔"

"اپن تو زیارت گئے تھے۔" ضیاء بولا۔

"کس کی زیارت کرنے گئے تھے؟" سرفراز نے پوچھا۔

"زیارت کرنے نہیں، زیارت گیا تھا۔ کوئٹہ کے پاس ہے زیارت۔ جہاں قائدِ اعظمؒ جا کر ٹھہرا کرتے تھے۔ کیا خوب صورت جگہ ہے یار۔ سبزہ ہی سبزہ، گھاس ہی گھاس۔"

"تمھارے تو عیش ہو گئے ہوں گے۔" سرفراز نے مسکرا کر کہا۔ "خوب کھائی ہوگی گھاس۔"

"ہاں۔" ضیاء نے کہا۔ "دو بوریاں تمھارے لیے بھی بھر کر لایا ہوں۔"

شہزاد نے کہا۔ "یار شہریار۔ تم نے نہیں بتایا کہ تم کہاں گئے تھے؟"

شہریار نے ایک لمبی سانس بھری اور کہا۔ "میں نے چھٹیاں اس بار یہیں کراچی میں گزاریں۔ اپنے ماموں کے گھر۔"

"تو اس میں اس قدر افسردہ نظر آنے کی کیا بات ہے۔" سرفراز نے پوچھا۔

"ہے ایک بات۔" شہریار نے کہا۔

شہزاد نے کہا۔ "ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ تمھارے ماموں کے گھر میں ایسی کیا بات ہو گئی۔"

"بات ذرا لمبی ہے۔ دھیان سے سُننی ہوگی۔" شہریار نے کہا۔

"بات کے لمبی ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" سرفراز بولا۔ "مگر بات فضول نہیں ہونی چاہیے۔ ہم سُننے کے لیے تیار ہیں۔"

شہریار نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ "ماموں ایک خاصی متمول بستی میں رہتے ہیں۔

متموّل کا مطلب سمجھتے ہونا۔ یعنی امیر بستی میں رہتے ہیں۔ میں چھٹیاں گزارنے کے لیے وہاں پہنچا تو سب بہت خوش تھے۔ ماموں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ عاصم۔ میرا اچھا خاصا دوست ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ چھٹیوں کے لیے کوئی تفریحی پروگرام بناتے ہیں۔ کوئی پکنک، کوئی مہم، کوئی سیر۔ میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ وہ بہت زیادہ خوش نہیں ہوا۔ کہنے لگا، یار تفریح تو گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا، گھر میں تفریح کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اور کہنے لگا، یہ رہی تفریح۔ جانتے ہو اس نے مجھے کیا دکھایا؟"

"نہیں — کیا دکھایا؟" ان سب نے بے اختیار پوچھا۔

"ویڈیو کیسٹ — اور وی سی آر۔" شہر یار نے مُسکرا کر کہا۔ "عاصم مجھ سے کہنے لگا۔ "یار تفریح کے لیے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں وی سی آر ہے، رنگین ٹی وی ہے، سڑک پر فلموں کی دکان ہے۔ جب چاہو پانچ روپے میں ایک ویڈیو فلم کرائے پر لے آؤ۔ اس سے اچھی تفریح اور کیا ہو سکتی ہے"۔ میں حیران رہ گیا۔ میں نے کہا، بھائی عاصم، ہم ہر روز محض فلمیں دیکھ دیکھ کر تو تفریح نہیں کر سکتے۔ بالآخر ہم تھک جائیں گے۔ آدمی آخر کتنی فلمیں دیکھ سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ عاصم میری بات سے اتفاق کرے گا۔ مگر اس نے تو مجھے یوں دیکھا جیسے کسی غیر انسانی مخلوق کو دیکھ رہا ہو۔ یا جیسے میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں۔ کہنے لگا، عجیب بات کرتے ہو شہر یار۔ بھلا آدمی فلموں سے بھی تھک سکتا ہے۔ پھر دوکان پر تو ہر طرح کی فلمیں ہیں۔ پاکستانی، بھارتی، اردو، پنجابی، انگریزی، سائنسی، پُراسرار، مار دھاڑ والی، ہنسنے ہنسانے والی۔ وہ دیر تک ان فلموں کی تعریف کرتا رہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اسے سمجھانا بے مقصد ہے۔ لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔"

"اور تم فلمیں دیکھنے بیٹھ گئے۔" سرفراز نے کہا۔

"ہاں۔" شہر یار نے کہا۔ "میں نے بے شمار فلمیں دیکھیں۔ اتنی فلمیں دیکھیں کہ نہ اُن کی کہانی یاد رہی، نہ ان کے نام۔ میں عاصم کے ساتھ کئی دوکانوں پر گیا۔ جہاں ویڈیو فلمیں ملتی تھیں۔ ہر دوکان میں سینکڑوں فلمیں تھیں۔ ویڈیو کیسٹ الماریوں میں زمین سے چھت تک بھرے ہوئے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی فلمیں ہر دوکان میں ہوتی ہوں گی۔ مگر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یقین کرنا ہی پڑتا تھا۔ عاصم نے ہی مجھے بتایا کہ پہلے ان فلموں کا کرایہ بہت ہوتا تھا۔ دن بھر کے لیے چالیس پچاس روپے دینے پڑتے تھے لیکن یہ تو ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ جب دکانیں کھلنے لگیں اور ویڈیو کیسٹ جگہ جگہ ملنے لگے تو کرایہ کم ہو کر بیس روپے

پھر پندرہ روپے، پھر دس روپے ہوگیا۔ ایک دن کا کرایہ۔ اب اتنی دُکانیں ہیں کہ ایک ویڈیو کیسٹ کا کرایہ محض پانچ روپے رہ گیا ہے۔"

"یہ جو آپ نے اتنی تحقیقات فرمائی۔" سرفراز بولا۔ "اس کا مقصد کیا تھا"؟

"مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ویڈیو فلموں کی یہ بیماری ہوتی کیا ہے؟" شہریار نے آخری گھونٹ بھر کر کپ نیچے رکھ دیا۔ "اور ہماری تمھاری عمروں کے لڑکے اس میں مبتلا کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ عاصم عجیب و غریب فلمیں دیکھتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ضیاء نے پوچھا۔

"ایک تو وہ بھارتی فلموں کا دیوانہ تھا۔" شہریار ہنسا۔ "مار دھاڑ سے بھرپور اُلٹی سیدھی فلمیں۔ جن میں ہیرو کئی منزلہ عمارتوں سے کُود جاتا تھا اور اُسے خراش تک نہیں آتی تھی۔ موٹر سائیکلیں پرواز کرتی تھیں۔ ہلکی پھلکی کاریں بڑی بڑی عمارتوں کے لوہے کے دروازے توڑ کر اندر گھس جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عاصم بریک ڈانس کی فلمیں دیکھتا تھا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" شہزاد نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بریک ڈانس ایک خاص طرح کا رقص ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ رقص کرنے والوں کے جسم ربڑ کے بنے ہوئے ہیں۔ اور وہ آدمی نہیں مشینی کھلونے ہیں۔ انھیں دیکھ دیکھ کر عاصم خود بھی اسی طرح ڈانس کرنے لگا تھا۔"

ضیاء بولا۔ "میں نے دیکھا ہے وہ بریک ڈانس۔ اسکول کے دو لڑکوں نے ایک دفعہ کر کے دکھایا تھا۔"

"کمال ہے یار۔" شہزاد نے کہا۔ "دُنیا میں پتہ نہیں کیسے کیسے انقلاب آرہے ہیں۔"

شہریار نے کہا۔ "یہ انقلاب نہیں ہے دوستو۔ یہ ہماری تمھاری عمر کے لڑکوں کی تباہی کا سامان ہے۔ تمھیں شاید اندازہ نہ ہو مگر میں نے وہ فلمیں دیکھی ہیں۔ بھارت کی فلمیں۔ ان کے ذریعے ہندو ہماری نوجوان نسل کو اپنی راہ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہندو مذہب کا پیغام ان فلموں کے ذریعے ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ وہ ہم مسلمانوں کی تاریخ کو غلط طور پر پیش کرتے ہیں۔ گاندھی اور نہرو جیسے عیار لوگوں کو اپنی فلموں کے ذریعے عظیم ثابت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کے کیا کیا نام ہیں۔ گانوں کے ذریعے وہ اپنے ہولی جیسے تہواروں کو ہمارے سامنے بڑے رنگا رنگ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ بڑی خاموشی سے ہمارے نوجوانوں کو اسلام سے اور پاکستان سے دُور کرنے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ بھول جائیں کہ پاکستان جب بنا تھا تو ہمارے لاکھوں بزرگوں کو انھوں نے شہید کر دیا تھا۔ یہ بھی بھول جائیں کہ سترہ سال پہلے انھوں نے ہمارے مُلک کے ایک حصّے، مشرقی پاکستان کو ہم سے الگ کر دیا تھا جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے سب ظلم بھول جائیں، سارے ستم فراموش کر دیں۔ تاکہ اگر کبھی وہ ہم پر حملہ کریں، ہمارے مُلک پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں تو ہم نوجوان ان کی مخالفت نہ کریں۔ یہ ..... یہ ہے ان کا منصوبہ .....!!"

کچھ دیر تک وہ سب خاموش رہے۔

شہر یار کی باتیں ان کے دلوں میں اب تک گُونج رہی تھیں۔

سرفراز نے کچھ دیر کے بعد کہا "کیسا شیطانی منصوبہ ہے۔"

"ہاں۔" شہر یار نے کہا "ایسا منصوبہ جو ہمارے خلاف ہے۔ ہم نوجوانوں کے خلاف۔"

شہزاد بولا "مگر ... مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے، حق اسکواڈ کیا کر سکتا ہے۔"

اس کا سوال سُن کر شہر یار مُسکرایا۔ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

پھر شہر یار بولا "ایک خاص خبر میں نے تم لوگوں کو نہیں دی۔"

"کون سی خاص خبر؟" ضیاء نے پوچھا۔

"ہمارے علاقے میں ایک نئی دکان کھُل رہی ہے۔ آج اس کا افتتاح ہے۔"

"کیسی دکان؟" سرفراز نے پوچھا۔

شہر یار بولا "دکان کا نام ہے۔ عنکبوت وڈیو سینٹر۔"

وہ چاروں ضیاء، شہزاد، سرفراز اور شہر یار ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر ان کے لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

ان کے دل کسی نئے عزم کے ساتھ دھڑکنے لگے۔

اور پھر کئی مہینوں کے بعد اس غار میں سرفراز کی آواز گُونجی۔ "حق اسکواڈ۔"

سب نے چلّا کر کہا "زندہ باد۔"

ان کے نعرے کی گُونج دیر تک سُنائی دیتی رہی۔

وہ دکان دُور سے ہی جگمگاتی نظر آ رہی تھی۔

چمکتے ہوئے بورڈ پر لکھا تھا "عنکبوت وڈیو سینٹر"۔ قریب ہی کپڑے کے ایک بینر پر لکھا ہوا تھا۔ "آج دھواں دار افتتاح۔ نئی فلمیں، نئے کیسٹ، رعایتی کرایہ"۔

ایک گول مٹول آدمی دکان کے دروازے پر کھڑا چلّا رہا تھا "آئیے بھائی جان۔ آئیے حضرات۔ آئیے آپا۔ آئیے خالہ۔ پانچ روپے، پانچ روپے۔ انڈین فلمیں دیکھیے۔ تازہ فلمیں آگئی ہیں۔ ایک سے ایک فلمیں۔ آہاہا۔ ایک سے ایک دھماکے۔ آہاہا۔ آئیے آپا۔ آئیے خالہ ...."

سڑک سے گزرنے والے لوگ اس گول مٹول آدمی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی تیز آواز دُور دُور تک سُنی جارہی تھی۔

یہ شاید اسی گول مٹول آدمی کا کمال تھا کہ عنکبوت وڈیو سینٹر میں گاہکوں کا ہجوم جمع ہوچکا تھا۔ بے شمار لوگ فلمیں کرائے پر لے رہے تھے۔ وڈیو سینٹر کا مالک فلم کرائے پر دینے سے قبل گاہک کا شناختی کارڈ ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ وہ ہر ایک سے کہتا تھا "جب فلم واپس کرنے آؤگے بابو جی۔ تو کارڈ مل جائے گا"۔

جب حق اسکواڈ کے چاروں ارکان۔ ضیاء، شہزاد، سرفراز اور شہریار وہاں پہنچے تو دکان میں بدستور لوگوں کا ہجوم تھا۔

لوگ فلمیں کرائے پر لے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو نئی فلموں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ حیرت انگیز۔ اور بہت افسوس ناک بات یہ تھی ... کہ فلمیں لینے والوں کے ہجوم میں کم عمر لڑکوں کی تعداد بہت تھی۔ وہ سب حق اسکواڈ والوں کی عُمر کے ہی تھے۔ مگر وہاں فلمیں لینے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

"دیکھ لیا بھائی؟" شہریار نے کہا۔

"ہاں، دیکھ لیا بھائی" سرفراز نے کہا۔

دکان کے باہر کھڑا گول مٹول آدمی چلّا رہا تھا "ایک دھماکہ۔ ایک پٹاخہ۔ آجاؤ خالہ۔ آجاؤ پھوپھا۔ فلمیں لے لو۔ سستی لے لو۔ جلدی سے لو۔ ساری لے لو"۔ پھر وہ کان پر ہاتھ رکھ کر گانے لگا "اُوپر پان کی دکان۔ نیچے گولو کا مکان۔ ارے اُوپر پان کی دکان ..."

سرفراز نے اس کے قریب پہنچ کر حیرت سے پوچھا "میاں شہزاد۔ یہ کیا چیز ہے؟"

شہزاد نے گول مٹول آدمی کو غور سے دیکھ کر کہا "فٹ بال ہے"۔

ضیاء نے کہا "نہیں نہیں۔ فٹ بال اتنی بڑی نہیں ہوتی۔ یہ تو مجھے کوئی دیگ لگتی ہے"۔

شہریار بولا "نہ یہ فٹ بال ہے نہ دیگ۔ یہ ایک بہت بڑا غبارہ ہے۔"

گول مٹول آدمی کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ حیرت سے ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سنبھل کر بولا "کیا بات ہے لڑکو؟ کیا فلمیں لینے آئے ہو؟"

"ہم دکان کے مالک سے ملنا چاہتے ہیں۔" شہریار نے کہا۔

"اچھا، اچھا۔" گول مٹول آدمی نے کہا۔ "گولو سیٹھ سے ملنے آئے ہو۔ گولو سیٹھ اندر بیٹھا ہے۔"

وہ چاروں اندر پہنچے تو انھیں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا آدمی دور سے ہی نظر آ گیا۔ وہ سچ مچ گولو لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں گول تھیں، ناک گول تھی اور وہ خود ایک گول دائرے کی طرح تھا۔ بہت بڑے گول دائرے کی طرح۔

شہریار نے جب اس سے کہا کہ یہ فلمیں نوجوان نسل کے لیے تباہی کا سامان ہیں لہٰذا اسے دکان بند کر دینی چاہیے۔ تو وہ کچھ دیر حیرت سے منہ کھولے بیٹھا رہا۔

"منہ بند کر لو بھائی۔" سرفراز نے کہا۔ "کوئی پرندہ اڑتے اڑتے اندر چلا جائے گا۔"

"بھاگ جاؤ اوئے۔" گولو سیٹھ نے غرا کر کہا۔

"ہم تمھیں سمجھانے آئے تھے گولو سیٹھ۔" ضیاء نے کہا۔ "اگر سمجھ جاؤ تو اچھا ہے ورنہ حق اسکواڈ کو کچھ اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"ادئے کیسا حق اور کون سا اسکواڈ" گوٹو سیٹھ نے کہا "ابھی میں تم لوگوں کو مزہ چکھاتا ہوں۔ ادئے ڈھولو ادئے بھولو۔ اِدھر آؤ۔ دیکھو یہ لڑکے کیا چاہتے ہیں"

شہریار نے دو سیاہ فام آدمیوں کو اچانک کہیں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ بہت لمبے تھے اور بہت طاقت ور لگتے تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

شہریار نے سرفراز کے کان میں سرگوشی کی "سرفراز۔ بھاگ نکلو"

سرفراز نے ضیاء اور شہزاد کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

ڈھولو اور بھولو نے ضیاء اور شہزاد کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ پلٹ کر بھاگ چُکے تھے۔ دکان کے ہجوم میں بچ کر نکلنا بہت آسان تھا۔

شہریار نے سرفراز کو بھی ایک گاہک کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر فرار ہوتے دیکھا۔

وہ خود تیزی سے دائیں طرف مُڑ رہا تھا کہ ایک بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا۔

شہریار بجلی کی تیزی سے مُڑا۔

مگر اس کی قمیص کا کالر گوٹو سیٹھ کے ہاتھ میں تھا۔

شہریار نے ایک جھٹکے سے کالر چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

اس نے سیاہ فام ڈھولو اور بھولو کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

پھر کیا ہوا؟

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سِلسلۂ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۴، کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز — بہترین تصاویر — اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں

عقیل عبّاس جعفری

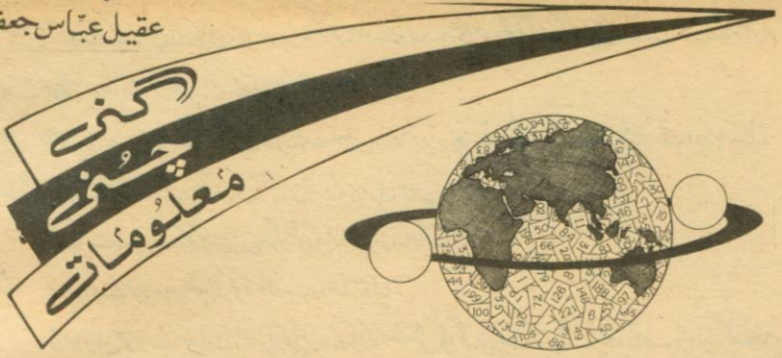

گنی چُنی معلُومات

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، اُن سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ۱ کے عدد سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

۲۱

- سورۃ اُلنّاس بلحاظِ ترتیب قرآنِ مجید کی آخری اور بہ اعتبارِ نزُول ۲۱ ویں سورت ہے۔
- پاکستان میں ووٹ ڈالنے کے لیے عمر کی کم سے کم حد ۲۱ سال ہے۔
- چیانگ کائی شیک کے عہد میں جو ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک ۲۱ برس جاری رہا، چین کا دارالحکومت نانکنگ تھا۔
- باکسنگ کا پہلا ہیوی ویٹ چیمپئن شپ کا مقابلہ ۷ ستمبر ۱۸۹۲ء کو جون سلیوان اور جیمز کاربٹ کے درمیان منعقد ہوا۔ یہ مقابلہ ۲۱ راؤنڈ تک جاری رہا تھا۔
- ٹیبل ٹینس میں جیتنے کے لیے ۲۱ پوائنٹ درکار ہوتے ہیں۔
- مرغی انڈے کو ۲۱ دن تک سیتی ہے۔ تب اس میں سے چُوزہ نکلتا ہے۔
- فرانکوئس متراں بلحاظِ ترتیب فرانس کے اکیسویں صدر ہیں۔
- مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کا آخری اجلاس ۱۸ اپریل ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا۔ یہ بلحاظِ ترتیب اس ادارے کا اکیسواں اجلاس تھا۔
- باکسنگ کے قوانین جو کوئنسبری رولز کہلاتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے مارکوئیس آف کوئنسبری نے

۲۱ برس کی عمر میں متعارف کروائے تھے۔

● نیل آرمسٹرانگ نے چاند کی سطح پر ۲۱ گھنٹے ۳۶ منٹ اور ۱۶ سیکنڈ قیام کیا تھا۔

(۲۲)

● بلیئرڈ کے کھیل میں ۷ مختلف رنگوں کی ۲۲ گیندیں استعمال کی جاتی ہیں۔

● محمد علی جب ۱۹۶۴ء میں سونی لسٹن کو شکست دے کر باکسنگ کے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن بنے تو ان کی عمر ۲۲ سال تھی۔

● روس اور امریکہ کا کم سے کم فاصلہ ۲۲ میل ہے۔

● سوئٹزرلینڈ میں ۲۲ صوبے ہیں۔

● دسمبر ۱۹۷۲ء میں اپالو ۱۷ کے ذریعہ جو گاڑی چاند پر بھیجی گئی تھی اس پر خلاباز جارج کیرنین اور ہیریسن شمٹ نے چاند کی سطح پر تقریباً ۲۲ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔

● کرکٹ کی پچ کی لمبائی ۲۲ گز ہے۔

● ۲۲ نومبر، سید سلیمان ندوی کی تاریخ پیدائش بھی ہے اور تاریخ وفات بھی۔

● عبرانی زبان میں ۲۲ حروف تہجی ہیں۔

● عالمی یوم اسکاؤٹ ۲۲ فروری کو منایا جاتا ہے۔ یہ سر لارڈ بیڈن پاول کا یوم پیدائش بھی ہے۔

● "بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ" دہلی کو کہا جاتا ہے۔

(۲۳)

● دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا اور دنیا کا ۲۳ واں بڑا دریا ہے۔

● برازیل کے پرچم پر ۲۳ ستارے بنے ہیں۔

● زمین اپنے محور پر ۲۳½ درجے جھکی ہوئی ہے۔

● روس کے پہلے خلاباز یوری گگارین کی پرواز کے صرف ۲۳ دن بعد امریکہ نے بھی اپنا پہلا خلاباز ایلن شیپرڈ خلا میں بھیج دیا تھا۔

● رومی حروف تہجی ۲۳ حروف پر مشتمل ہے۔

● ۲۳ اپریل شیکسپیئر کی تاریخ پیدائش بھی ہے اور تاریخ وفات بھی۔

● ہارون الرشید نے ۲۳ سال ۶ ماہ حکومت کی تھی۔

● ۱۵ مارچ ۴۴ء کو جب بروٹس نے جولیس سیزر کو قتل کیا تو اس کے جسم پر ۲۳ مہلک زخم آئے تھے۔

● ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ہفتے کا دن تھا۔

● جوش ملیح آبادی کا پہلا مجموعۂ کلام "روحِ ادب" ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ برس تھی۔

● ۲۳ر اپریل ۱۶۱۶ء کو شیکسپیئر کا بھی انتقال ہوا اور ڈان کیخوتے کے مصنف سروانتے کا بھی۔

(۲۴)

● ۱۹۸۸ء میں سیئول جنوبی (کوریا) میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیل، جدید دور کے ۲۴ ویں اولمپکس ہیں۔

● حضورِ اکرمؐ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ پہنچے تھے۔

● کرۂ ارض ۲۴ ٹائم زونز میں منقسم ہے۔ جن میں سے گیارہ روس میں سے گزرتے ہیں۔

24TH PARALLEL بھارت اور پاکستان کو جدا کرتا ہے۔

● منشی پریم چند کے مشہور افسانے کفن میں فقط ۲۴ گھنٹے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

● یونانی زبان میں ۲۴ حروفِ تہجی ہیں۔ ۲۴ واں حرف اومیگا کہلاتا ہے۔

جان ایف کینیڈی کے قتل کے وقت ان کے قاتل لی ہاروے آسوالڈ کی عمر صرف ۲۴ برس تھی۔

● ۲۴ مئی ۱۵۴۳ء کو کوپرنیکس کی وفات ہوئی اور اسی دن اس کی معرکۃ الآرا کتاب، جس میں اس نے سورج کے گرد زمین اور دوسرے سیاروں کی گردش کا نظریہ پیش کیا، شائع ہوئی۔

● مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کے موجد آئزک پٹ مین نے جب ۱۸۳۷ء میں مختصر نویسی کے اصولوں پر مبنی پہلی کتاب "اسٹینوگرافر ساؤنڈ" شائع کی تو ان کی عمر صرف ۲۴ برس تھی۔

● کاغذ کے ایک دستے میں ۲۴ کاغذ ہوتے ہیں۔

جوابات "آپ کتنے ذہین ہیں"

(۱) ظاہر ہے، ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی معلوم ہونے سے پہلے بھی دنیا کا بلند ترین پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ ہی تھا۔

(۲) سلمیٰ، نجمہ کی ماموں زاد بہن ہے۔ ریحانہ، نجمہ کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ ریحانہ اور سلمیٰ آپس میں کزن نہیں ہیں۔

(۳) چار گھنٹے میں۔

(۴) اب شاید صاحب ٹرین نہیں پکڑ سکتے ہیں کیونکہ جس رفتار سے انہوں نے پہلا میل طے کیا ہے اسی میں دو منٹ صرف ہو چکے ہیں اور اسٹیشن سے ایک میل پہلے ہی آٹھ بج چکے ہیں۔

(۵) پہلی غلطی تو یہ ہے کہ لفظ جملہ کے بجائے جملا لکھے گئے ہیں۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ غلطیاں کی جگہ غلطی لکھا گیا ہے۔ اور تیسری غلطی یہ ہے کہ اس جملے میں صرف دو غلطیاں ہیں۔

انسانوں سے پیار کرو

محمّد جاوید خالد

فرق نہ پیدا، چھوٹے بڑے کا ، ہم نفسو بیکار کرو
گورے کالے سب ہیں برابر
انسانوں سے پیار کرو
انسانوں سے پیار کرو

پیار کے بیج تو بو کر دیکھو ، اِن کی خوشبو مہکے گی
ہمدردی کی فصل اُگاؤ
صحرا کو گلزار کرو
انسانوں سے پیار کرو

کونپل کونپل رنگ بکھیرو ، دُکھ سُکھ میں یک جائی کے
صحنِ چمن کی رِیت کو بدلو
نفرت سے انکار کرو
انسانوں سے پیار کرو

اُلفت کی ڈوری میں پرودو رنگ و نسل کے دانوں کو
جامِ محبت بھرتے چلو سب
دُنیا کو سرشار کرو
انسانوں سے پیار کرو

سب کو یکساں حق حاصل ہے اس دنیا میں جینے کا
اِس کو سمجھو، اِس کو مانو
اِس کا ہی پرچار کرو
انسانوں سے پیار کرو

پاکستان بھر میں آنکھ مچولی کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے " آنکھ مچولی " سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

محمد حسین برادرز ۔ کراچی	فون:۔ ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی ۔ لاہور	فون:۔ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب ۔ راولپنڈی	فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی ۔ حیدر آباد	فون:۔ ۲-۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی ۔ چوک یادگار ۔ پشاور	فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس ۔ ملتان	فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو ۔ فیصل آباد	فون:۔ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز ۔ کوئٹہ	فون:۔ ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز ۔ سیالکوٹ	فون:۔ ۸۷۹۸۹

سعید بک اسٹال ۔ گجرات	فون:۔ ۰۴۳۳۱
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال سرگودھا	فون:۔ ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی ۔ بہاولپور	فون:۔ ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی ۔ جہلم	فون:۔ ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز ۔ رحیم یار خان	فون:۔ ۲۶۲۶
وہاڑی نیوز ایجنسی ۔ ریل بازار ۔ وہاڑی	
اسلم نیوز ایجنسی ۔ اخبار گھر ۔ گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی ۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ ۔ اوکاڑہ	
نیا مکتبۂ اردو ۔ جی ٹی روڈ ۔ سرائے عالمگیر	

سلمان برادرز ۔ نوابشاہ ۔ فون:۔ ۲۴۱۴

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینجر ۔ ماہنامہ " آنکھ مچولی " ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ نورس روڈ ۔ سائٹ ۔ کراچی ۱۶

غاروں سے چوباروں تک

انسان کے رہائشی سفر کی داستان

سیّد خورشید عالم

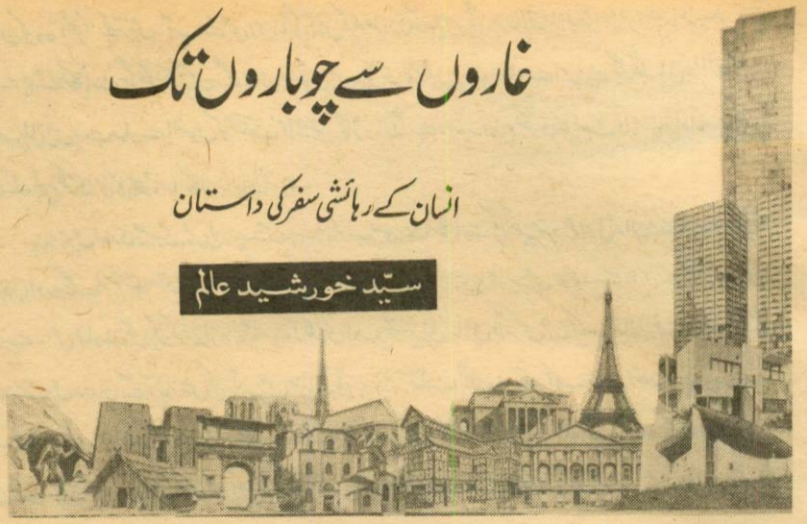

اگر آپ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائیں تو آپ کو دُور دُور تک ہزاروں مکانات بنے ہوئے نظر آئیں گے جن کی چھتوں پر ٹی وی کے انٹینا نصب ہوں گے۔ مگر آج سے ہزاروں برس پہلے نہ تو مکانات تھے اور نہ ہی انسانوں کی منظّم آبادی۔ انسان غاروں اور جنگلوں میں رہتا تھا۔ بھوک لگتی تو جانوروں کا شکار کرتا اور اُن کا گوشت کچا ہی کھا جاتا۔ موسم سرد ہو یا گرم، آندھی آئے یا تیز بارش وہ غاروں یا گھنے درختوں کے نیچے موسم کی سختیاں برداشت کرتا رہتا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور قدیم دور کے انسان نے پہلے گھاس پھوس سے اور پھر مٹّی سے اپنے لیے رہنے کا ٹھکانہ بنایا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی ہوتی گئی۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دُنیا میں عظیم الشان تعمیراتی منصوبے عراق، مصر، یونان اور روم میں شروع کیے گئے۔ ان میں سے کچھ تو صحیح سلامت اور کچھ کھنڈرات کی شکل میں آج بھی اس دور کے انسانوں کی تعمیراتی کاوشوں کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انسان فطرتاً انجینیر واقع ہوا ہے۔ آج بھی آپ کو گھاس پھوس، لکڑی، کھالوں اور کپڑوں کے بنے ہوئے جھونپڑے اور خیمے نظر آئیں گے تو کہیں اُونچی اُونچی عمارتیں جو آسمان سے باتیں کر رہی ہوتی ہیں۔

عرب کے بدّو کپڑے اور اُون کے خیموں میں رہتے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل کیے جا سکتے ہیں۔ خود شمالی امریکا کے ریڈ انڈین بھینس کی کھال کے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔ قطبین پر رہنے والے برف سے اپنے لیے مکان بناتے ہیں۔ اس مکان کی شکل گول ہوتی ہے۔ اندر پورے کنبے کے رہنے کا معقول بندوبست ہوتا ہے۔ اِس

مکان کو وہ "اِگلُو" کہتے ہیں۔ آپ نے بھی اس نام کی آئس کریم ضروری کھائی ہوگی۔ برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا وغیرہ میں بانس پر بنے ہوئے مکانات جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ ان علاقوں میں چونکہ بارش زیادہ ہوتی ہے اس لیے جگہ جگہ پانی کھڑا نظر آتا ہے۔ پانی میں بہت سارے بانسوں کو مختلف فاصلے پر گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب ان پر لکڑی کا پلیٹ فارم بنا لیا جاتا ہے پھر اس کے اوپر لکڑی ہی کا چھوٹا سا مکان بنا لیا جاتا ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں بہت خوب صورت مکانات کی تعمیر شروع ہوئی۔ ان مکانات کی تعمیر میں پتھروں اور سنگِ مرمر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دور کی ایک یادگار آج بھی برطانیہ میں موجود ہے۔ اس کا نام لٹل مورٹن ہال ہے۔ اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لکڑی اور دیگر تعمیراتی سامان لا کر کس طرح ایک شاندار عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ سترہویں صدی کے آغاز میں فنِ تعمیر میں مزید ترقی ہوئی۔ مختلف قصبے اور شہر ایک خاص منصوبہ بندی سے بنائے جانے لگے۔ اسی طرح آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپس کے اختلافات بھی بڑھنے لگے۔ نتیجے کے طور پر جنگیں بھی ہوئیں۔ چنانچہ اب یہ ضرورت بھی آن پڑی کہ دشمنوں سے حفاظت کے لیے مضبوط قلعے بنائے جائیں۔ چنانچہ بڑے بڑے قلعے تعمیر کیے جانے لگے۔ جن کی دیواریں بہت بلند، مضبوط اور ناقابلِ شکست ہوتی تھیں۔ آپ میں سے بہت سے ساتھیوں نے یقیناً لاہور کا شاہی قلعہ اور خیر پور میں رانی کوٹ کا قلعہ دیکھا ہوگا۔

جب انسان نے پختہ عمارات کی تعمیر شروع کی تو اسے اندازہ ضرور معلوم تھا کہ عمارت کی تعمیر کے لیے پتھر سب سے زیادہ پائیدار ہے۔ کیوں کہ پتھر بہت کم گھستا ہے اور یہ ہر قسم کے موسمی اثرات سے بھی پاک ہوتا ہے۔ مگر جو علاقے پتھریلے نہیں ہوتے تھے وہاں دور دراز سے پتھر توڑ کر لائے جاتے تھے۔ یہ طریقہ بڑا مہنگا پڑتا تھا۔ چنانچہ مٹی سے اینٹ بنائی گئی جو مضبوطی اور پائیداری میں پتھر کے بعد اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ عمارتوں میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے خوب صورت ٹائیلیں بنائی گئیں۔ سیمنٹ کی دریافت نے تعمیرات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اب لوہے اور سیمنٹ کو آپس میں ملا کر اگر کوئی شخص اپنا تین کمروں والا مکان بناتا ہے تو دوسری طرف ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، ورلڈ ٹریڈ سینٹر، شاہ فیصل مسجد حبیب بینک پلازہ اور مینارِ پاکستان جیسی عظیم الشان عمارتیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ آج فنِ تعمیر میں جتنی ترقی ہوئی ہے کل ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور مستقبل میں نئے سیاروں اور زیرِ آب جو ترقی فنِ تعمیر میں کل ہوگی آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کرتے۔

"جب تم کسی کو اپنا دوست بناؤ تو اس سے جنگ نہ کرو اور اس پر اپنی برتری کا اظہار مت کرو اس کی نگرانی نہ کرو۔ دوسروں سے اس کے بارے میں مت پوچھو کیونکہ ممکن ہے، اس کا دشمن تمہیں غلط بات بتا دے اور یہ غلط فہمی تمہاری جدائی کا باعث بنے۔" مرسلہ: سعدیہ ممتاز ـــــــ کراچی

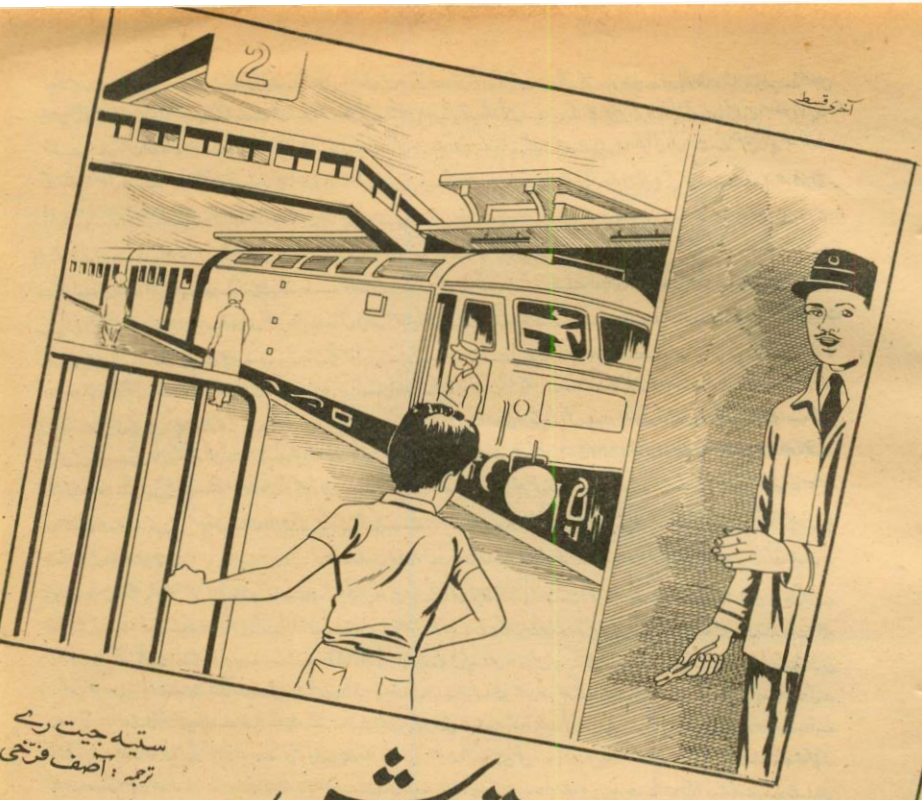

آخری قسط

تلاش

ستیہ جیت رے
ترجمہ : آصف فرخی

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس پر انکشاف ہوا کہ اُسے کچھ یاد نہیں۔ وہ اُس وقت سڑک کے کنارے ایک جنگل میں پڑا تھا اور اُس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ وہ اُٹھا اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھا تو اُسے ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی نظر آئی، جس کی اگلی اور عقبی سیٹ پر دو آدمی ساکت پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ آگے چلا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا ہے؟ راستے میں پیڑوں پر بنے ہوئے سیاہ اور سفید حلقوں کو سمجھنے کی کوشش سے اُس کا سر شدّت سے درد کرنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُسے دُودھ پیش کر رہا ہے۔ اُس آدمی نے اُس کا نام پوچھا تو وہ نہ بتا سکا۔ ایک اور آدمی کے مشورے پر اُسے پولیس اسٹیشن لے جایا جانے لگا۔ راستے بھر وہ لوگ اُس سے مختلف سوال کرتے رہے، مگر وہ ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا۔ وہ لوگ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹّی کے لیے لے گئے۔ جہاں سے وہ غسل خانے کے راستے فرار ہوگیا۔
بھاگتے بھاگتے وہ ریل کی پٹڑی پر جا نکلا اور وہاں سے ایک اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل گاڑی آئی تو وہ اس میں سوار ہونے لگا۔ مگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے سوار نہ ہو سکا اور ریل چل پڑی۔ وہ ریل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا اور ایک کھُلے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ اُسی وقت اندر سے ایک بازو نکلا اور کسی نے اُسے اندر گھسیٹ لیا۔ اندر گھسیٹنے والے شخص نے بھی اس سے بہت سے سوال کیے، مگر وہ اسے بھی کچھ نہ بتا سکا۔ ہاں البتہ اس نے اپنا ایک فرضی نام ارمان احمد جمال بتایا۔ اس شخص کا نام ہارون الرشید تھا اور وہ ایک بازی گر تھا اور کرتب دکھاتا تھا۔ ہارون نے اُس سے کہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسری طرف ملک کے مشہور وکیل احمد علی دانیال اپنے بیٹے ببلو کی گمشدگی کے سلسلے میں انسپکٹر سے بات کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا

کہ چار آدمیوں نے بلبو کو اغوا کیا۔ راستے میں ان کی گاڑی کی ٹرک سے ٹکر ہوگئی۔ دو آدمی وہیں مر گئے اور دو آدمی سیمسن اور رگھوناتھ بھاگ گئے۔ بلبو گاڑی سے دُور جا گرا تھا۔ دانیال صاحب نے اس بات پر یقین نہیں کیا اور یہ کہہ کر انسپکٹر کے کمرے سے نکل آئے کہ اگر بدمعاشوں نے تاوان طلب کیا تو وہ رقم انھیں دے دیں گے۔ پھر پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے یا نہیں یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہاں سیمسن اور رگھوناتھ نے شمالی کلکتہ پہنچ کر حلیہ تبدیل کیا اور اُس بوڑھے نجومی کے پاس پہنچے، جس کے پاس وہ اغوا کی واردات کے متعلق زائچہ معلوم کرنے گئے تھے۔ انھوں نے اسے غلط پیش گوئی کرنے پر لتاڑا اور ڈرا دھمکا کر فیس میں دیے گئے دس روپوں کے بدلے اُس کی ساری جمع پونجی سمیٹ لے گئے۔ اِدھر ہارون نے ارمان کو ابراہیم بابو کے ہوٹل میں ملازم رکھوا دیا۔ ارمان کچھ ہی دن میں اپنے کام میں مشاق ہوگیا۔ اب وہ تیزی سے گاہکوں کو چائے اور کھانا لا کر دیتا۔ وہ ابراہیم بابو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اتوار کو اُس کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس اتوار کو ہارون اُسے شہید مینار لے گیا، جہاں میلہ لگا تھا اور لوگ قسم قسم کے تماشے دکھا رہے تھے۔ ہارون نے بھی ایسے حیرت انگیز کرتب دکھائے کہ میلے کے سارے لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اس تماشے سے ہارون کو کافی آمدنی ہوئی۔ ارمان بدستور ابراہیم بابو کے پاس کام کرتا رہا۔ ایک دن ایک خوفناک شکل والا بدمعاش ایک معمولی شکل والے آدمی کے ساتھ ہوٹل میں آیا۔ اس نے ارمان سے اس کے متعلق کچھ سوالات کیے، جن کے ارمان نے اُلٹے سیدھے جواب دے کر جان چھڑائی۔ شام کے قریب ہارون اُسے اپنے ساتھ اپنا گھر دکھانے لے گیا۔ ارمان نے دیکھا کہ ہارون کا کمرہ بے شمار چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ ہارون نے اُسے اپنی آپ بیتی سُنائی کہ وہ کس طرح بازی گر بنا؛ پھر اُس نے محلّے کے بچّوں کو ایک ساتھ پانچ گیندیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر تین چھُریاں اُچھالنے کا حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ کرتب کے بعد ہارون نے ارمان کو بتایا کہ اُس نے دو مشکوک آدمیوں کو دیکھا ہے، جو اب بھی باہر گلی میں کھڑے ہیں۔ اُن کا حلیہ سُن کر ارمان نے بتایا کہ وہ دونوں اُسے بھی چائے خانے میں ملے تھے۔ ہارون کا اندازہ تھا کہ وہ دونوں سیمسن اور رگھوناتھ ہیں جو گاڑی کے حادثے میں بچ گئے تھے۔ وہ ارمان کو پچھلے دروازے سے نکال لے گیا۔ وہاں احمد علی دانیال کے بنگلے میں اُن کے بیٹے بلبو کی گمشدگی کے سلسلے میں اجلاس ہو رہا تھا، جس میں انسپکٹر کے علاوہ اُن کے بیٹے بھی شریک تھے۔ انسپکٹر نے تجویز پیش کی کہ بلبو کی بازیابی کے لیے اخباروں میں اشتہار چھپایا جائے، جس میں انعام کا بھی اعلان ہو۔ دانیال صاحب اس بات پر راضی ہوگئے۔ ہارون، ارمان کو ان دو بدمعاشوں سے بچا تو لے گیا تھا، مگر اُسے مسلسل یہ فکر لگی رہتی تھی کہ وہ ارمان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ہارون نے اِس اتوار کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر کرتب دکھایا، مگر چونکہ اُس کا ذہن ارمان میں اُلجھا ہُوا تھا، اس لیے کرتب صحیح نہ ہو سکا اور لوگ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ ارمان اور ہارون گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہارون نے وضاحت کی کہ ایسا کیوں ہُوا! اس نے اپنا اندازہ بتایا کہ گاڑی کے حادثے کے بعد سیمسن اور رگھوناتھ جب ہوش میں آئے تو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ارمان کو بھی مُردہ سمجھ کر چلے گئے، لیکن پھر ابراہیم بابو کے چائے خانے میں اُسے دیکھ کر انھیں گویا اپنا شکار پھر مل گیا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک آواز سُن کر چونک گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو سیمسن اور رگھو کو کھڑے پایا۔ ہارون نے اپنے بازی گری کے تھیلے سے سیمسن پر وار کیا۔ اور وہ دونوں سرپٹ بھاگ نکلے۔ سیمسن اور رگھو بھی اُن کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہارون نے ایک ٹیکسی روکی اور وہ پھرتی سے اس میں بیٹھ کر اُن دونوں سے دُور ہوتے چلے گئے۔ ارمان کے ذہن میں گاڑیوں کی روشنیاں گڈمڈ ہونے لگیں۔ یکایک اُس کے ذہن میں جھماکا سا ہُوا اور اُسے یاد آنے لگا کہ وہ کون ہے! اُس کا ماضی اُس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔ اُس کی یادداشت واپس آچکی تھی۔ اُس نے ہارون کو اپنے گھر کے متعلق ساری باتیں بتائیں۔ ہارون نے طے کیا کہ اگلے دن وہ ارمان کا حلیہ درست کر کے اُسے اُس کے گھر چھوڑ آئے گا۔ دوسرے دن ہارون نے ارمان کو اچھے کپڑے پہنائے اور ابراہیم بابو سے اجازت لے کر ارمان کو اُس کے گھر لے جانے لگا۔ وہاں دانیال صاحب اپنے کلرک۔ بابو سے اخبارات میں چھپنے والے ارمان کے تلاش گمشدہ کے اشتہار کے متعلق بات کر رہے تھے کہ گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رُکی اور اُن کا بیٹا بلبو اندر داخل ہُوا۔ دانیال صاحب حیران رہ گئے اور بلبو سے سوال پر سوال کرنے لگے۔ پھر اُنھوں نے اس آدمی کو اندر بُلوایا جو اُن کے بیٹے کو لایا تھا۔ ہارون کو دیکھ کر دانیال صاحب نے اُس کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کی اور اُس سے بلبو کے حالات پوچھے۔ جب ہارون نے بتایا کہ اُن کا بیٹا چائے خانے میں کام کرتا تھا تو دانیال صاحب کو غصّہ آگیا۔ انھوں نے اس شک کا اظہار کیا کہ ہارون نے انعام کے لالچ میں بلبو کو اپنے پاس روکے رکھا تھا۔ ہارون کو یہ بات پسند نہیں آئی اور وہ چلا گیا۔ گھنٹے بھر بعد انسپکٹر نے فون کر کے بتایا کہ بلبو کو اغوا کرنے والے بقیہ دو بدمعاشوں سیمسن اور رگھو کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دانیال صاحب نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا اور سب کچھ بھول بھال گئے۔۔۔!

اب آپ آگے پڑھیے

ساڑھے چار بجے ہری ناتھ بلبو کو بُلانے آیا۔ چائے کا وقت ہوگیا تھا۔ لیکن بلبو اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ ہری ناتھ کو اس پر کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ بلبو کا دوست تین گھر چھوڑ کر رہتا تھا۔ بلبو اتنے دن کے بعد اُسی سے ملنے گیا ہوگا۔ جلدی ہی آجائے گا۔

بلبو اپنے دوست سے ملنے تو گیا تھا، لیکن اُس دوست سے نہیں جسے ہری ناتھ سمجھ رہا تھا۔ وہ باغ کی پچھلی دیوار پر چڑھا، تاکہ دربان اُسے جاتے ہوئے دیکھ نہ لے، دیوار سے اُتر کر لوڈن اسٹریٹ پارک، پارک اسٹریٹ میں آیا لوئر سرکلر روڈ سے گزرتا ہُوا سی آئی ٹی روڈ پر آگیا۔ یہاں سے وہ راستہ پوچھتا ہُوا پُل پر آیا، سیڑھیاں اُتر کر کچی بستی

میں آیا اور چلتا ہی رہا، کبھی سیدھے ہاتھ، کبھی الٹے ہاتھ، جیسے اُسے راستہ یاد تھا۔ جب وہ ملے کے پاس کھڑی ہوئی عورتوں کے سامنے سے گزرا، تو بچّوں نے اُسے پکارا۔

"ہارون بھیّا نہیں ہیں۔۔۔" وہ چلّانے لگے۔ "ہارون بھیّا چلے گئے۔"

ببلو کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہُوا۔

"کہاں گئے وہ؟" اُس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

لُنگی پہنے ہوئے ایک بوڑھا آدمی ٹوٹی پھوٹی کُٹیا میں سے نمودار ہوا۔

"ہارون کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "اسٹیشن گیا ہے۔ وہ مدراس کی گاڑی میں سوار ہو رہا ہے۔ کسی سرکس نے اُسے بُلا بھیجا ہے۔"

گلی کے بچّوں نے ببلو کو بتایا کہ دس نمبر کی بس اُسے ہوڑہ اسٹیشن لے جائے گی۔ وہ اس کے ساتھ بس اسٹاپ تک آئے۔ ببلو اپنی جیب میں وہ پیسے سنبھال کر رکھتا تھا جو ابراہیم بھائی نے اُسے دیے تھے۔ اس نے بس کا ٹکٹ خریدا اور آگے جا کر پلیٹ فارم ٹکٹ بھی خرید لیا۔

اگر ہارون بھیّا کی گاڑی چلی گئی، تو کیا ہوگا۔؟

"مدراس کی ریل؟ کون سا پلیٹ فارم؟ مدراس کی ریل؟"

"سات نمبر، لڑکے، وہ وہاں پر۔ نمبر دیکھ رہے ہو؟"

ریل گاڑی لمبے سفر کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شام کا جھٹپٹا ہونے والا تھا۔ ببلو ہانپتا ہوا تیزی کے ساتھ مجمع میں ڈھونڈنے لگا۔ سیکنڈ کلاس۔۔۔ سیکنڈ کلاس۔۔۔ سیکنڈ کلاس۔۔۔ فرسٹ کلاس۔۔۔ وہ کہنیوں سے اور دھکّوں سے راستہ بناتا ہوا سامان اور قُلیوں اور مسافروں کے درمیان سے گزرتا رہا یہاں تک کہ ایک جگہ اُسے راستہ بند ملا۔

چائے کی دُکان کے گرد اکٹھا ہونے والی بھیڑ تالیاں بجا رہی تھی اور چائے کی تین پیالیاں ان کے سروں کے اُوپر ہوا میں گردش کر رہی تھیں۔

ریل کے روانہ ہونے سے پہلے ہارون اپنا آخری کرتب دکھا رہا تھا۔

ببلو بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا! تم یہاں!"

ہارون کو چیخنا پڑا کہ اس کی آواز تالیوں کے شور میں سنائی دے جائے۔

اس نے چائے کی پیالیاں دکان والے کو واپس کیں اور ببلو کی طرف مُڑا۔

"تم اس بستی میں گئے تھے؟ ان لوگوں نے تم کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں؟" بیلو کچھ نہیں بولا تو ہارون خود ہی کہتا رہا! "میں نے تمہیں وینکٹیش کے خط کے بارے میں بتایا تھا، یاد ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ بڑا اچھا موقع ہے میں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میں ایک پہیئے کی سائیکل پر گھومتے ہوئے آنکھوں پر پٹی باندھ کر دکھاؤں گا۔ اس کے لیے ایک مہینے تیاری کرنی ہوگی۔ اسی لیے میں پہلے سے جا رہا ہوں۔"

بیلو نے چاہا کہ پیسوں کے بارے میں کچھ کہے، لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ مدراس کا سرکس بڑا اچھا موقع تھا ہارون خوب پیسے کما سکتا تھا۔ وہ خوش نظر آتا تھا۔ اگر انعام کی رقم کا سُن کر وہ پریشان ہوگیا، تو؟

تو اس کا دِل کتنا بُرا ہو رہا تھا، یہ ہارون کو معلوم تھا۔ اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"گھر میں اتنا مزا نہیں آرہا؟" ہارون نے پوچھا۔

"نہیں ہارون بھیّا۔"

"وہ ارمان تمہیں پریشان کر رہا ہے، ہے ناں؟ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ یہی کہہ رہا ہوگا ابراہیم بھیّا کے وہاں کتنا اچھّا تھا! اسکول بھی نہیں تھا! اور مزے مزے کے لوگ چائے خانے میں آتے رہتے تھے! ہارون بھیّا اور ان کا کرتبوں والا تھیلا۔ ان کے ساتھ کلکتہ کی سڑکوں پر آوارہ پھرنے میں بہت مزا تھا۔ یہی کہہ رہا ہے، ناں؟"

اس نے سر ہلایا۔ ہارون بھیّا بالکل صحیح کہہ رہے تھے۔

"اچھا ہوگا اگر تم اس کو ڈانٹ کر بھگا دو۔ ورنہ وہ تمہیں پڑھنے نہیں دے گا۔ اور یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اپنے آپ کو کتنا بُرا بھلا کہتا ہوں کہ اسکول کیوں چھوڑ دیا؟"

"لیکن آپ تو فن کار ہیں! آپ تو اتنے اچھے تماشے دکھاتے ہیں!"

"کوئی میں اکیلا ہی تو نہیں ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ بڑے سارے گھر میں رہ کر اور اسکول میں پڑھ کر فن کار نہیں بن سکتے؟ میں گیندوں سے کرتب دکھا سکتا ہوں۔ کوشش کرو تو تم لفظوں، رنگوں اور سُروں سے کرتب دکھا سکتے ہو! ذرا سوچو تو سہی! تمھارے پاس کرتب دکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی ہنر ہوگا، اور پھر تم جان لوگے کہ تم کس طرح کے فنکار بن سکتے ہو۔ پھر تم..."

بیلو اب ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی۔ اسے ہارون بھیّا کو بتا دینا چاہیئے۔ وہ بلند آواز سے چیخا: "لیکن ابّا نے آپ کو انعام نہیں دیا، ہارون بھیّا! پانچ ہزار روپے! آپ ان کے بغیر تو نہیں جا سکتے!"

ہارون ریل پر چڑھ گیا اور آگے جھک کر مُسکرانے لگا۔

"تمھاری صورت کو تو دیکھو ان لوگوں نے کیا کیا ہے؟ تم بالکل کنگ کانگ کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔"

ہارون کو معلوم تھا۔ اس نے اشتہار دیکھ لیا تھا۔

انجن نے سیٹی بجائی۔ ببلو اس کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔

"اپنے ابّا سے میری طرف سے کہہ دینا" ہارون نے کہا "کہ ان کے بیٹے کو ان کے پاس واپس پہنچانے کے لیے ان کے پیسے لینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس لڑکے کے لیے پیسے کیسے لوں، جو میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔؟"

ریل چل پڑی۔ ببلو کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا۔ اس نے سُنا کہ ہارون اعلان کر رہا ہے "انمول ہیرا سرکس! آپ کے شہر میں آئے تو دیکھنا نہ بھولیے! ایک پہیے کی سائیکل پر بیٹھ کر اور آنکھوں پر پٹّی باندھ کر تب!"

"سرکس کلکتہ بھی آئے گا؟"

ببلو ریل کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے گا...

"اور کیا۔ کلکتے میں سرکس کے شوقین سارے دیس سے زیادہ ہیں"

ہارون ہاتھ ہلا رہا تھا۔

ہارون دور، اور دور ہوتا جا رہا تھا۔

ہارون اب نظر نہیں آ رہا تھا۔

ریل اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔

اے لو۔ اس کو پھر ہری بتّی دکھائی دی۔ ہری بتّی سگنل ہوتی ہے۔ ببلو کو اب معلوم ہو گیا تھا۔ ہری بتّی اس بات کا سگنل دیتی ہے کہ لائن صاف ہے۔

ببلو نے اپنی آنکھیں آستین سے پونچھ ڈالیں اور گھر کا رُخ کیا۔ اس کی جیب میں لکڑی کی دو گیندیں تھیں اور ایک دوست کی یاد... ایسا دوست، جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ جس سے اُس نے بہت کچھ حاصل کیا تھا... جو اس کے دل کے کسی گوشے میں چُھپا ہوا تھا۔

جس کا نام تھا! ارمان احمد جمال

اب ببلو کو معلوم ہو گیا۔ اس کے ابّا نے ہارون بھیّا کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ ببلو کبھی کبھار اخبار پڑھتا تھا۔ وہ کھیلوں کا صفحہ اور بچّوں کا صفحہ پڑھتا تھا۔ اس نے گم شدہ افراد کے بارے میں چھپنے والے اشتہار دیکھے تھے۔ ان اشتہاروں کے ساتھ تصویریں ہوتی تھیں اور انعام کا اعلان۔ کیا اس کے ابّا نے بھی ایسا ہی اشتہار دیا تھا؟

بلو نیچے اپنے ابا کے دفتر گیا جہاں اخبار رکھے جاتے تھے۔ اسے وہ اشتہار دس اخباروں اور پانچ زبانوں میں ملا۔ ہر ایک کے ساتھ وہ تصویر تھی جو نعمان نے دار جلنگ میں سنچل جھیل کے کنارے کھینچی تھی۔ جو شخص نادر پیار کا نام بلو کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم کرے گا' اسے پانچ ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔

ہارون نے اس صبح اخبار نہیں دیکھا تھا، نہ انعام کی طلب کی تھی۔ پھر بھی یہ اُسے ملنی چاہیئے تھی' مانگے بغیر۔ اس کے ابا کو چاہیئے تھا کہ وہ رقم اُسے دے دیتے۔ اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔

بلو کو یہ بات اتنی بُری لگی کہ وہ گھر سے نکل آیا' باغ میں چلا گیا اور امرود کے پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے ابا نے ہارون کو دھوکا دیا تھا۔ ہارون ان پیسوں سے اپنے کرتب کے لیے بہت ساری چیزیں خرید سکتا تھا۔ وہ اچھے، آرام دہ کمرے میں منتقل ہو سکتا تھا۔ پھر اُسے بہت دن تک پیسوں کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنا باقی وقت آرام سے گزار سکتا تھا۔ ہنستے، کھیلتے اور گیندیں اُچھالنے کے کرتب دکھاتے ہوئے۔

ہارون نے شاید اب تک اخبار پڑھ لیا ہو اور یہ اشتہار دیکھ لیا ہو۔ وہ کیا سوچتا ہوگا؟

بلو گھر میں آگیا۔ یہ بڑا کمرہ تھا... آرام دہ اور وسیع، صوفے، کتابوں کی الماریوں، گل دان، تصویروں اور مجسّموں سے بھرا ہوا۔ لیکن کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو دل کو خوش کر دے۔ فرنیچر کے اُوپر چڑھے ہوئے گرد پوش اتنے بد رنگ اور پُرانے ہو چکے تھے کہ ان کے نقش و نگار مٹ چکے تھے۔ کوئی انھیں بدلتا ہی نہ تھا۔ جب اس کی بڑی بہن یہاں تھیں، تو وہ یہ سارے کام کرتی رہتی تھیں۔ اب کسی کو پروا ہی نہیں تھی۔

بلو کچھ دیر صوفے پر پیر ٹکائے بیٹھا رہا۔ دیوار کے گھنٹے نے چار بجائے۔ اس نے پڑوس میں ڈیوک کو بھونکتے ہوئے سُنا۔ شاید اُس نے پورچ میں سے سڑک کے کسی کُتّے کو دیکھ لیا تھا۔ ہارون نے بھی تو ایک دن اُسے سڑک کا کُتّا کہا تھا۔ شاید سڑک کا کُتّا بھی اس سے بہتر تھا۔

بلو کی دادی اماں نے کچھ دیر اس کا بہت لاڈ کیا۔ اس کو کلیجے کا ٹکڑا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کہا، اس کا سر اور پیٹھ سہلائی، یہاں تک کہ جن جگہوں پر تکلیف ہوتی تھی' وہ پہلے سے بھی زیادہ دُکھنے لگیں۔ ان کی آواز سُن کر بلو کو احساس ہوا کہ جس دنیا میں وہ رہتی ہیں، اُس کی دُنیا سے کتنی دُور ہے۔

نعمان ڈھائی بجے والی گاڑی سے کھڑگ پور چلا گیا۔

"ذرا سوچو" اس نے بلو سے کہا "تم عین کھڑگ پور میں تھے... راستہ بھٹکے ہوئے اور نام بھولے، ہوئے... اور میں تم سے میل بھر دُور تھا' اسی شہر میں، اور مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تمھارے ساتھ کیا ہو رہا ہے! ایک دفعہ وہ بدمعاش میرے ہاتھ تو آجائیں! کراٹے کے ایسے داؤں لگاؤں گا کہ اپنے باپ کا نام بھی بھول جائیں گے۔ خیر، یہ تمھارے لیے

تھوڑا سا کام ہے، جو کچھ ہوا اسے لکھ ڈالو۔ انگریزی میں۔ تم مضمون لکھنے میں اچھے خاصے ہوا کرتے تھے۔ اچھا تو پھر، لکھ کے رکھنا اور اگلی بار میں آؤں تو مجھے دکھانا۔ کیا خیال ہے؟"

گھر کی کوئی بھی چیز بابلو کے لیے نامانوس نہیں تھی۔ ایک ایک کونہ اس کا دیکھا بھالا تھا، ہر کمرہ، برآمدہ، زینے کی ہر سیڑھی۔ اس کے کمرے کی دیوار پر سیلن کا ایک دھبہ تھا جس کی شکل افریقہ جیسی تھی۔ وہ اس پر بہت حیران ہوا کرتا تھا۔ اس نے اُسے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ پھیل گیا ہے۔ اب وہ شمالی امریکہ کے نقشے جیسا ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر بوس ساڑھے تین بجے آئے۔ وہ گول مٹول سے آدمی تھے، جن کا چہرہ بھی گول تھا، اور ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ بابلو کو ایک سو چار درجے بخار ہوتا تب بھی ہنستے رہتے تھے۔ نعمان کا خیال تھا کہ ان کے چہرے کے اعصاب ہی ایسے ہیں۔ وہ جب نہیں بھی ہنس رہے ہوتے، تب بھی ہنستے ہوئے لگتے۔ ہری ناتھ ڈاکٹر صاحب کا بیگ لے آیا۔ بابو بھی آیا اور دادی اماں بھی، جو پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے جھانکتی رہیں۔ بابلو کے ابا کچہری چلے گئے تھے۔

"تمھیں پتا ہے تم کتنے قیمتی ہو، بابلو صاحب؟" ڈاکٹر بوس نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔ "تمھارے جیسے پانچ ہوں تو ایک ایمبیسڈر گاڑی آ سکتی ہے۔ کیا خیال ہے تمھارا؟"

بابلو کو اس وقت ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بعد میں سمجھا، جب اس کا معائنہ کرنے اور اس کے شانے پر ہاتھ مارنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بابو سے پوچھا۔ "کون ہے وہ خوش قسمت آدمی؟ پانچ ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔"

"جی ہاں، وہ آدمی ..." بابو گلا صاف کرنے لگا۔ "اس کا نام ..."

ڈاکٹر صاحب نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ "بہت اچھا، بابلو بابو۔ میں کسی دن آؤں گا تب سارا قصہ تم سے سنوں گا۔" انھوں نے کہا ... وہ چلے گئے، اور ان کے پیچھے پیچھے بابو اور ہری ناتھ بھی باہر آ گئے۔

راہنما

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

سچی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے۔

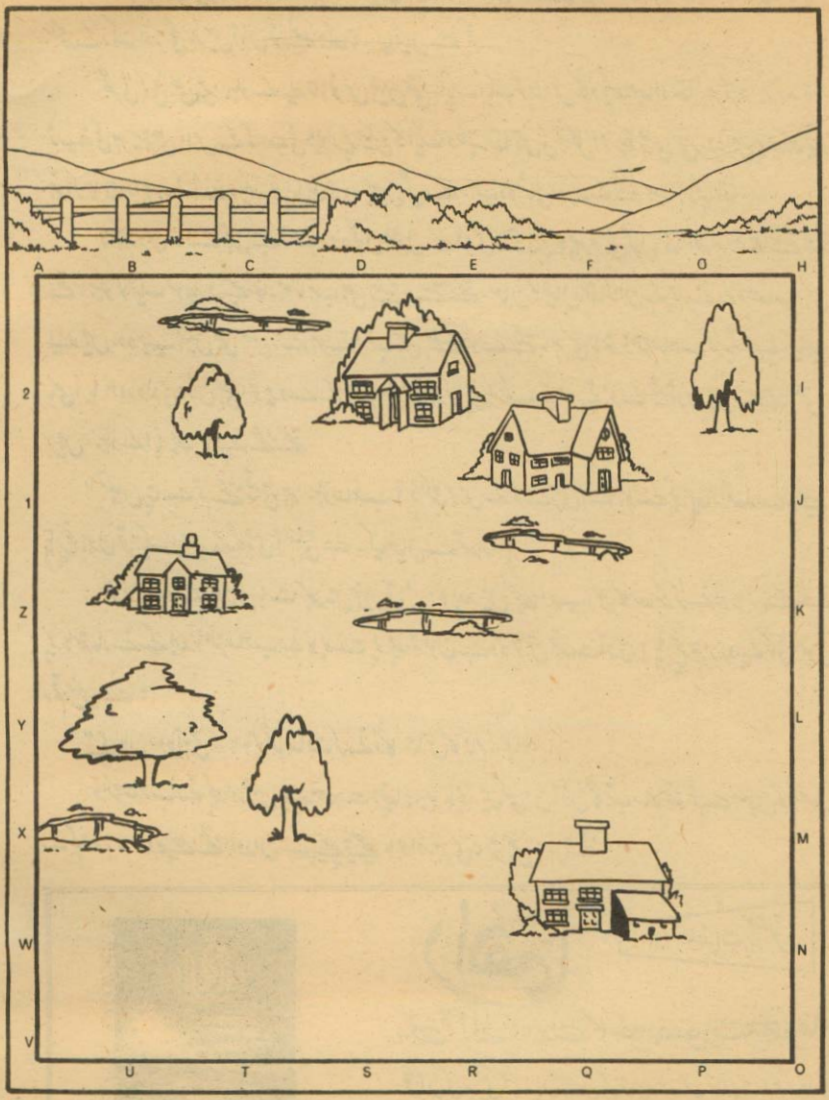

ایک صاحب اپنے بیٹوں کو چار پلاٹ دینا چاہتے ہیں۔ ہر پلاٹ میں مکان، درخت اور تالاب ہونا ضروری ہے۔ ذرا ان کی مدد تو کریں

ماہانہ مقابلۂ معلومات

سوال در سوال

اسامہ بن سلیم

"ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ" کا نیا سلسلہ آپ کو پسند آیا۔ ہمارے اطمینان کے لیے آپ کی یہ یقین دہانی کافی ہے۔

بڑی تعداد میں ساتھیوں کی شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوالات بہت آسان تھے۔ ہم نے یہ سوچ کر آسان سوالات کا انتخاب کیا تھا کہ جیسے جیسے آپ اس نئے طرز کے مقابلۂ معلومات سے واقف ہوتے جائیں گے، ویسے ویسے ہم اس کے معیار کو بھی بڑھاتے جائیں گے۔

نئے پڑھنے والوں کے لیے ہم ایک بار پھر اس مقابلے میں شرکت کا طریقۂ کار بتا رہے ہیں۔

- تمام سوالات کو بغور پڑھیے اور ان کے جوابات کوپن نما صفحہ کے چھوٹے خانوں میں بالترتیب لکھ دیجیے۔
- تمام جوابات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ پہلے جواب کا دوسرے سے، دوسرے کا تیسرے سے یوں گویا دسویں سوال تک تمام جوابات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ آپ کے نزدیک ان جوابات کا آپس میں جو بھی مضبوط ترین تعلق ہو۔ آپ اُسے مستطیل نما لمبے خانے میں لکھ دیجیے۔
- جوابات اور اُن کے باہمی تعلق کے علاوہ اپنا نام اور پتہ لکھ کر کوپن کا پورا صفحہ بڑی نفاست سے کاٹیے اور ہمیں روانہ کر دیجیے۔
- جوابات موصول ہونے کی آخری تاریخ اس ماہ کی (۲۵) ہے۔
- تمام درست جوابات بھیجنے والے ساتھیوں کے نام ایک ماہ کے فرق کے ساتھ شائع کر دیے جائیں گے۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعہ تین خوبصورت انعامات بھی دیے جائیں گے۔
- پہلا انعام ۱۰۰ روپے کے پرائز بانڈ یا پوسٹل آرڈر ہوں گے جبکہ بقیہ دونوں انعامات کتب یا رسائل کی شکل میں ہوں گے۔

- مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کے صفحے کا آنا ضروری ہے۔
- کوپن کی فوٹو اسٹیٹ یا ہاتھ سے بنی ہوئی نقل قابلِ قبول نہ ہوگی۔
- اپنے جوابات صاف خوش خط اور مختصر تحریر کریں۔

سوالات

① دنیا کا سب سے بلند مقام کوہ ہمالیہ کی چوٹی ہے جو براعظم ایشیا میں ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ نشیبی علاقہ یا پست ترین مقام سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۹۲ فٹ نیچا ہے۔ بتلیے یہ کس براعظم میں ہے؟

② دنیا کی سب سے لمبی ریلوے لائن کس ملک میں ہے۔؟

③ "ستی" ایک ہندوانہ رسم ہے جس کے مطابق شوہر کے مرنے کے بعد شوہر کی لاش اور اس کی زندہ بیوی کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں "ستی" کا یہ واقعہ کس ملک میں پیش آیا؟

④ گاندھی کی پیروکار ایک سیاسی رہنما خاتون، جو کچھ عرصہ یوپی کی گورنر بھی رہیں۔ ان کا نام کیا تھا؟

⑤ ۱۸۸۵ء میں قائم ہونے والی ایک سیاسی تنظیم جس کی بنیاد اے او ہیوم نے ہندوستان کی بعض معروف شخصیات کے ساتھ مل کر رکھی؟

⑥ "پاکستان کی سرکاری زبان صرف اُردو ہوگی اور اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پاکستان کا دشمن ہے۔" یہ الفاظ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کانووکیشن اجلاس میں کس عظیم شخصیت نے کہے؟

⑦ کس ملک کا آئین غیر تحریری کہلاتا ہے؟

⑧ "جوہن لوگی بیئرڈ" ایک موجد کا نام ہے۔ آپ اس کی شہرۂ آفاق ایجاد کا نام بتا دیجیے؟

⑨ پاکستان کی مواصلاتی تاریخ میں ۱۹۶۴ء کی کیا اہمیت ہے؟

⑩ ڈاکٹر جی الانا پاکستان کی کس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں؟

ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ ماہ اگست ۱۹۸۸ء

۲	۱	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق
۳		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق
۴		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق
۵		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق
۶		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق
۷		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق
۸		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق
۹		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق
۱۰		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

حاصل کردہ نمبر

نام _____ مکمّل پتہ _____

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PH_NE: 293451

جہاں چلے، رواں چلے

BOND

ٹیٹو کی برساتی

شیبال چکرورتی
ہندی سے ترجمہ
سیّد عبدالعزیز عزمی

ٹیٹو اس سال موسم برسات سے پہلے ہی ایک رین کوٹ لینا چاہتا تھا اور وہ مسلسل اپنی والدہ کو پچھلی گرمیوں سے کہہ رہا تھا، لیکن اس کا باپ ایک غریب آدمی تھا اور وہ اس برساتی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن ٹیٹو اس برساتی کو لینے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کے پاس مختلف ڈیزائن اور رنگوں کے برساتی کوٹ تھے۔ وہ بار بار اپنی ماں اور باپ شیام لعل سے کوٹ کے لیے ضد کر رہا تھا۔ آخر پچھلے ہفتے جب شیام لعل اپنے کام سے واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا پیکٹ تھا، جس میں ٹیٹو کے لیے ایک خوبصورت نیلے رنگ کا برساتی کوٹ تھا۔ ٹیٹو کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ آج اس کا مہینوں پُرانا خواب حقیقت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اُس شام وہ بہت خوش تھا کہ وہ خوشی میں شام کی پڑھائی بھی اچھی طرح نہ

کر سکا۔ اُس نے برساتی کوٹ پہن لیا اور اپنے بیڈروم میں لگے ہوئے بڑے سے شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ کافی دیر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھتا رہا۔ وہ آئینے میں اپنے لباس سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا دوسرے بھی اُس کی خوشی میں خوش ہوں۔ لہٰذا وہ تیزی سے پچھلے دروازے سے نکلا اور رُوپا کو اپنا نیا برساتی کوٹ دکھانے چلا گیا۔ رُوپا ٹیٹو سے دو سال بڑی تھی۔ ٹیٹو نے روپا دیدی کو پکارا۔ وہ دونوں گہرے دوست بن گئے تھے۔ آج سے پانچ سال پہلے جب رُوپا کے والد ٹیٹو کے گھر کے برابر آ گئے تھے۔

"روپا دیدی! دیکھو آج بابو میرے لیے کیا لے کر آئے ہیں! یہ پوری دُنیا کا سب سے اچھا تحفہ ہے۔" ٹیٹو نے فخریہ انداز سے کہا۔ اور نیلا برساتی کوٹ رُوپا کو دکھانے لگا۔

"بہت پیارا ہے۔" روپا نے ٹیٹو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا برساتی کوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ برساتی کوٹ پسند کرتی تھی بلکہ ٹیٹو کی خوشی نے اُسے متاثر کیا تھا۔ "دکھاؤ یہ تمھارے لیے فٹ بھی ہے یا نہیں!" رُوپا، ٹیٹو کو برساتی کوٹ پہنانے لگی۔

رُوپا اس وقت ٹیوشن پڑھ رہی تھی۔ اس کے اُستاد بوڑھے گوکل داس اُس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ گوکل بابو ستّر سال کے تھے۔ پستہ قد اور بھُورے بالوں والے گوکل بابو انگلش اور تاریخ پڑھانے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے ٹیٹو کو کوٹ پہنے ہوئے دیکھا اور کہا "تم بہت اسمارٹ لگ رہے ہو۔ ٹیٹو۔۔۔!"

"شکریہ۔ ! گوکل بابو"! ٹیٹو نے خوش ہو کر جواب دیا۔

اگلی صبح وہ بہت جلدی اُٹھا، دوڑتا ہُوا بالکونی میں پہنچا اور آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ آسمان سورج کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ پورے آسمان پر کہیں بھی بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیٹو اُداس ہو گیا۔

دوسری رات سونے سے پہلے اُس نے بارش کے لیے دُعا کی۔ ٹیٹو کو برساتی کوٹ بہت انتظار کے بعد ملا تھا اِس لیے وہ اُسے فوری طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن آسمان پر اُڑنے والے نیلے بادل اُسے مایوس کر رہے تھے۔

وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ جہاں اُس کی ماں ناشتے کی تیاری میں مصروف تھی۔ ٹیٹو نے اپنی ماں سے کہا: "ماں آسمان کو دیکھو اس پر کوئی بادل نہیں ہے۔ اگر بارش نہ ہوئی تو برساتی کوٹ رکھنے کا کیا فائدہ؟"

"یہ کوئی ضروری نہیں ٹیٹو۔۔۔!" ماں نے اُسے تسلّی دی: "یقیناً بارش ہوگی۔ ابھی جُون کا مہینہ ہے کچھ انتظار کرو کئی مہینے بارشوں کے آئیں گے۔"

اُس دن کے بعد ٹیٹو اپنا برساتی کوٹ اسکول بیگ میں رکھ کر لے جانے لگا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ شاید اسکول سے واپسی پر دوپہر کے وقت بارش ہو جائے۔ اور وہ اسکول سے گھر تک کا راستہ برساتی کوٹ پہن کر طے کر سکے۔ لیکن ٹیٹو کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

دِن پر دِن گزرتے رہے مگر بارش کا دُور دُور تک کہیں نشان نہ تھا۔ آسمان صبح کے وقت بھی اتنا صاف ہوتا تھا جتنا دوپہر کو۔ ٹیٹو اُداس ہو گیا اگر بارش نہ ہوئی تو اُس کے برساتی کوٹ پہننے کا جوش اور خوشی سب ختم ہو جاتی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد جب ٹیٹو اپنا برساتی کوٹ اسکول بیگ میں لے کر اسکول سے واپس آ رہا تھا تو اُس کی ملاقات بڑے مندر کے پاس گوکل بابو سے ہوئی۔

"ہیلو ٹیٹو ---!" بوڑھے گوکل بابو نے اپنی گونج دار آواز میں کہا: "میرے خیال میں تم اسکول سے واپس گھر جا رہے ہو ---!"

"جی ہاں جناب ---!" ٹیٹو نے جواب دیا۔ اُس نے گوکل بابو کو غور سے دیکھا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ گوکل بابو بے حد غریب آدمی ہیں۔ روپا دیدی نے بھی اُسے یہی بتایا تھا۔ ورنہ وہ اتنی عُمر میں کیوں محنت کرتے؟ اُن کا لباس بھی بوسیدہ اور پُرانا تھا۔ گھسی ہوئی چپلیں اور بوسیدہ سی چھتری اُن کے ہاتھ میں تھی۔ جس میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ ایک دن ٹیٹو نے خود سُنا تھا کہ رُوپا کی ماں سمترا نے گوپال انکل سے کہا تھا: "تم نے رُوپا کے ٹیوٹر کی چھتری دیکھی ہے۔ اگر کسی دن بارش ہو گئی تو وہ اُسے استعمال بھی نہیں کر سکتا!"

گوپال انکل نے صرف سر ہلاتے ہوئے کہا تھا: "میں نے بھی محسوس کیا ہے اور سوچتا ہوں کسی دن ان کو نئی چھتری دلا دُوں گا۔"

اس بات کو ایک سال ہو گیا تھا مگر گوکل بابو آج تک اپنی پُرانی اور بوسیدہ چھتری استعمال کر رہے تھے۔ ٹیٹو کو ایسے لوگ عجیب لگتے تھے، جو کسی اہم کام کو کل پر چھوڑ دیتے ہیں جیسے اس کا باپ کچھ ہفتے پہلے تک اس کے برساتی کوٹ کو ہمیشہ بھول جاتا تھا۔

دِن پر دِن گزرتے رہے، مگر بارش نہ آئی۔ ٹیٹو کا یہ معمول تھا کہ وہ روز صبح اُٹھ کر آسمان کو دیکھتا اور موسم کی خبر اخبار میں پڑھتا، لیکن آسمان ہمیشہ نیلا رہتا اور موسم کی خبریں کبھی سچ ثابت نہیں ہوتی تھیں۔ ٹیٹو سخت ناخوش تھا۔ اسے اب اپنی پڑھائی میں بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور اپنی ماں کے پکائے ہوئے لذیذ کھانے بھی مزیدار نہیں لگتے تھے۔

ہر صبح آسمان ٹیٹو کو مایوس کر دیتا۔ وہ کچن میں آ کر اپنی ماں سے پوچھتا: "ماں! دیکھو کتنے دِن گزر گئے اور یہ مُون سون کا موسم بھی ہے، لیکن مجال ہے جو ایک قطرہ بھی پانی کا گرا ہو۔ میں روز برساتی کوٹ لے جاتا ہوں، مگر واپس پھر بغیر استعمال کیے لے آتا ہوں ---!"

ماں مُسکراتی اور کہتی: "تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ بارش ضرور ہو گی اور اتنی کہ تم یہ برساتی استعمال کر کر کے تھک جاؤ گے۔"

ٹیٹو نے آسمان کو دیکھا۔ آسمان پر اُس وقت گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور پانی سے بھرے ہوئے بھی تھے۔ مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ زمین ویسے ہی خشک تھی: "یہ بارش بھی عجیب ہے، جب خواہش نہ کریں تو آ جاتی ہے اور اب میری تو نئی برساتی بھی آ گئی ہے، مگر بارش کا کہیں پتا نہیں۔!"

ایک دن بارش واقعی آ گئی۔ وہ ہفتے کی دوپہر تھی۔ ٹیٹو اپنے اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ صبح سے آسمان صاف تھا۔ اور

شام کو ٹیٹو اپنے قریبی دوست دیپ کے یہاں اس کی سالگرہ پر مدعو تھا۔ اس کے دوستوں نے کئی رنگ برنگے غباروں اور میوزک آرکسٹرا کا انتظام کیا تھا۔ دیپ کے انکل گگن بابو دہلی میں کام کرتے تھے۔ ان کو کئی جادوئی کمالات آتے تھے جنھیں دیکھ کر لڑکے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔

ٹیٹو اپنے ساتھ برساتی کوٹ بھی لایا تھا۔ جب گگن بابو اپنے جادو کا آخری آئٹم دکھا رہے تھے تو اسی لمحے ایک زوردار آواز کے ساتھ بجلی چمکی اور ٹیٹو نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ شروع میں بارش ہلکی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہو گیا۔ ٹیٹو نے کھانے کے بعد اپنے دوست سے اجازت لی اور گھر کی طرف چل دیا۔ ٹیٹو بے حد خوش تھا۔ وہ سر سے پیر تک اپنے نئے برساتی کوٹ میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھاری محسوس کر رہا تھا۔ بارش کی بوندیں اُس کے برساتی کوٹ کے سر کے حصّے پر گر رہی تھیں اور درختوں اور زمین پر گرتا ہوا پانی ٹیٹو کے دماغ میں موسیقی کی جل ترنگ بجا رہا تھا۔

جب ٹیٹو مندر کے قریب پہنچا تو بارش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ مندر کے برآمدے میں گوکل بابو بے بسی کے عالم میں کھڑے ہیں۔ ان کے پاس گو پرانی چھتری تھی۔ مگر ایسی موسلا دھار بارش میں وہ چھتری استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ انتظار کر رہے تھے کہ کب بارش رُکے اور وہ اپنی اگلی ٹیوشن کو جا سکیں۔ ٹیٹو گوکل بابو کی جانب بڑھا۔ اور اُن سے پوچھا "کیا آپ بس اسٹاپ تک جانا چاہتے ہیں۔ گوکل دادا؟"

"ہاں۔۔۔!" گوکل بابو نے جواب دیا۔ وہ جلدی سے بس اسٹاپ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی اس شام کی آخری ٹیوشن کو بھی مکمل کر سکیں۔ جسے بارش نے لیٹ کر دیا تھا۔

"کیا آپ میرا برساتی کوٹ استعمال نہیں کر سکتے؟" ٹیٹو نے پوچھا۔ گوکل بابو کے چہرے پر خوشی اُمڈ آئی۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھ آئے۔ ٹیٹو کے ہمدردانہ رویّے نے انھیں متاثر کیا تھا۔ ٹیٹو نے اپنا برساتی کوٹ اُنھیں دے دیا۔

"میری پُرانی چھتری مکمل طور پر ناکارہ ہو چکی ہے۔" گوکل بابو نے کہا "لیکن میں اپنی یہ ٹیوشن کسی طرح بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ طالب علم مجھ پر انحصار کرتے ہیں۔ ہر سال میں سوچتا ہوں کہ نئی چھتری خریدوں گا۔۔۔ مون سون کا مہینہ میرے لیے کافی تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ مجھے بہت سفر کرنا پڑتا ہے۔" گوکل بابو نے غمگین انداز میں کہا۔

"آپ ایسا برساتی کوٹ کیوں نہیں خرید لیتے، جیسا میرا ہے؟" ٹیٹو نے مسکرا کر کہا۔ "بہت دلچسپ محسوس ہوتا ہے جب اس کو پہن کر بارش میں چلا جائے۔۔۔!"

"ہاں، بہت اچھا لگتا ہے لیکن۔۔۔!" گوکل بابو اچانک خاموش ہو گئے۔ ٹیٹو نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ پانی سے بھری سڑک پر چلتے رہے۔ ٹیٹو نے گوکل بابو کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر اُداسی اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دل گوکل بابو کے لیے اپنائیت کے احساسات سے بھر گیا۔

"تمھارا شکریہ کہ تم میرے ساتھ یہاں تک آئے"۔ گوکل بابو نے کہا۔ اب وہ بس اسٹاپ تک پہنچ گئے تھے۔ بس پانچ منٹ کے بعد آئی۔ سوار ہونے سے پہلے بوڑھے اُستاد نے گرم جوشی سے ٹیٹو سے ہاتھ ملایا۔ پھر بس چلی گئی اور سڑک پہلے کی طرح سنسان ہوگئی۔ ٹیٹو کچھ دیر وہاں کھڑا گوکل بابو کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر آگیا۔ اسکول کے ہوم ورک اور گھر کے کام کاج میں بھی اُس کا دل نہ لگا۔

بارش رات کو ہی رُک گئی تھی۔ جب ٹیٹو گہری نیند سو رہا تھا۔ اگلی صبح آسمان پہلے کی طرح صاف ہوگیا۔ اُس کی ماں نے دُودھ سے بھرا گلاس میز پر رکھ دیا۔ اور ٹیٹو سے مُسکرا کر کہا "تم یقیناً کل بے حد خوش ہوگے"۔

ٹیٹو نے اپنی ماں کے مُسکراتے چہرے کی جانب دیکھا۔

"تم بارش میں اپنے برساتی کوٹ کے ساتھ چلتے ہوئے کافی لُطف اندوز ہوئے ہوگے" ماں بولی "لیکن آج آسمان صاف شفّاف ہے۔ تم یقیناً آج ناخوش ہوگے"۔

"لیکن کیوں ماں۔۔۔!" ٹیٹو نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر سوال کیا۔

ماں نے آسمان کی جانب اشارہ کیا اور کہا "دیکھو۔۔۔! بادل کل سارا دن آسمان کو ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن آج آسمان صاف ہے اور آج چھٹی کا دن بھی ہے۔ چھٹی کے دن تم زیادہ بہتر طور پر بارش سے لُطف اندوز ہو سکتے تھے۔ لیکن آج نیلا آسمان صاف ہے۔۔۔!"

ٹیٹو بھاگتا ہوا بالکونی کی جانب گیا۔ آسمان مکمل طور پر صاف تھا۔ بادل کا ہلکا سا ٹکڑا کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے ماں کی جانب دیکھا اور کہا "نہیں ماں۔! اب بارش مجھے خوش نہیں کرسکتی"۔

ٹیٹو اُداس ہوگیا۔ اُس نے حسرت بھرے انداز سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اُسے دُور کہیں ایک پانی سے بھرے بادل کا ٹکڑا نظر آیا۔ اُس نے دل میں کہا "اے بادل! اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو دوبارہ میرے علاقے میں نہ آنا"۔ پھر ٹیٹو نے مُڑ کر اپنی ماں سے کہا۔

"میں ایسے آسمان کو پسند کرتا ہوں ماں! جو صاف شفّاف ہو۔ اور۔۔۔ اور جس پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ ہو۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ یہ نیلا صاف آسمان مجھے کتنی خوشی فراہم کر رہا ہے"۔ یہ کہہ کر ٹیٹو نے بالکونی بند کر دی۔

اعلان یہ واقعہ خود ہمارے سامنے پیش آیا ہم دوستوں کی کرکٹ ٹیم ایک گاؤں میں میچ کھیلنے کے لئے گئی۔ ابھی میچ شروع ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ مسجد میں اعلان ہوا۔ ہم سب وہ اعلان سن کر ہنسنے لگے۔ اعلان کچھ یوں تھا "پرا، چراغ دی ککڑی کسے دے گھر آنڈا دے آئی اے جدے گھر ککڑی نے آنڈہ دتا اے وہ آنڈہ چراغ دے گھر پہنچا دے"۔ (بھائی چراغ کی مرغی کسی کے گھر انڈہ دے آئی ہے جس کے گھر مرغی نے انڈہ دیا ہے وہ چراغ کے گھر انڈہ پہنچا دے)۔

ملک جاوید اقبال، ڈھوک ڈھکال، راولپنڈی

احمد

خالص دیسی گھی سے تیار کردہ

فریش ویل سویٹس

آپ کے اعلیٰ ذوق کی بھرپور تسکین کیلئے

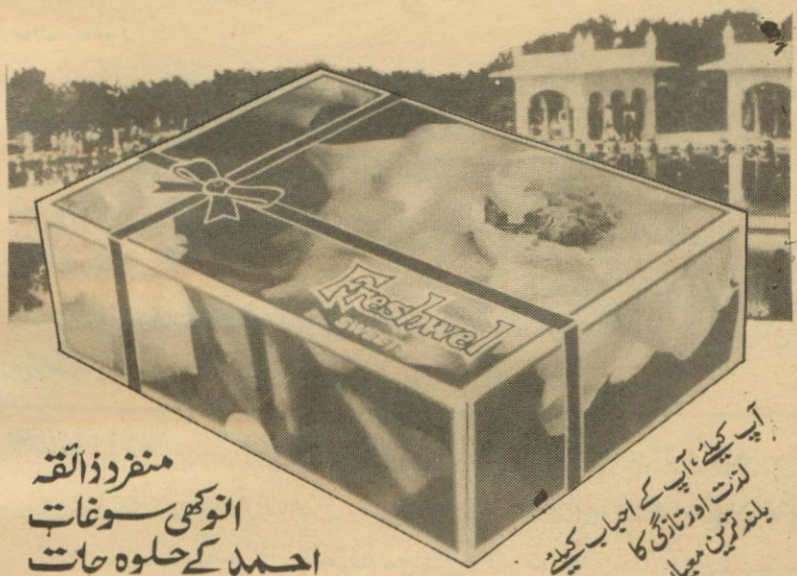

منفرد ذائقہ
انوکھی سوغات
احمد کے حلوہ جات

آپ کیلئے، آپ کے احباب کیلئے
لذت اور تازگی کا
بلند ترین معیار

نئی تحریریں

حمد باری تعالےٰ

مُرسلہ محمد اللہ رضوان ۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

اے خدا، اے خُدا — کون ہم سَر تیرا
دہر میں چار سُو — تو ہے جلوہ نما
تو ہے روزی رساں — اپنی مخلوق کا
لب پہ جاری رہے — تیری حمد و ثنا
مجھ گنہگار کی! — تجھ سے ہے یہ دُعا
کردے نظرِ کرم! — بخش دے ہر خطا

آج کے طالب علم

محمد عادل منہاج۔ نیو کراچی

ماسٹر صاحب کے کلاس سے نکلتے ہی کلاس میں شور گونجنے لگا۔ سب طالب علم باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ آدھی سے زیادہ کلاس کمرے سے نکل کر ٹہلنے لگی۔ دو تین بچے بلیک بورڈ پر اُلٹے سیدھے جملے لکھنے لگے۔ اور چاک کے ٹکڑے ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ ایک عجب شور و غوغا تھا۔ اچانک بچوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور سب دھڑا دھڑ کلاس میں داخل ہو گئے۔ دوسرے پریڈ کے ماسٹر صاحب آرہے تھے۔ ماسٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔ سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے چند طالب علموں نے کھڑا ہونا گوارا نہ کیا۔

ماسٹر صاحب نے حاضری کے لئے رجسٹر کھولا۔ اسی وقت چند طالب علم دروازے میں نمودار ہوئے یہ ابھی تک باہر گھوم رہے تھے۔ ماسٹر صاحب نے انہیں گھورا اور اندر آنے کا اشارہ کیا اور حاضری لینے لگے۔ طالب علم اپنے اپنے نمبر پر "یس سر" کہہ رہے تھے۔ بہت سے طالب علموں نے اپنے غیر حاضر دوستوں کے نمبر پر بھی "یس سر" کہہ دیا۔ حاضری ختم ہونے کے بعد ماسٹر صاحب نے رجسٹر بند کیا ہی تھا کہ چند بچے اپنی کرسیوں

پر سے کھڑے ہو گئے۔ "سر، ہماری حاضری رہ گئی ہے۔"
"سر، رول نمبر ۲۶ کی حاضری لگا دیں۔"

"سر، ہماری حاضری بھی لگا دیں۔" ..... ماسٹر صاحب غصّے سے بولے۔ جب میں حاضری لے رہا تھا۔ اس وقت آپ کہاں تھے؟" — "سر، میرا قلم گر گیا تھا اُسے ڈھونڈنے کے چکر میں حاضری نکل گئی۔" ایک طالب علم نے کہا۔ "اور سر میں حاضری بولنے لگا تھا تو نذیر نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔" دوسرا بولا۔ اس کے بعد سب نے یکے بعد دیگرے بہانے بنائے۔ اور ماسٹر صاحب نے انہیں دو تین صلواتیں سنائی اور ان کی حاضری لگاتے ہوئے بولے، "اب آئندہ احتیاط کیجیے گا میں بار بار حاضری نہیں لگاؤں گا۔" اس کے بعد انہوں نے رجسٹر بند کر دیا۔ "سر، میں اندر آ سکتا ہوں۔" ایک طالب علم دروازے میں آ کر بولا۔ "کہاں تھے اب تک؟" ماسٹر صاحب بولے۔ "پانی پینے گیا تھا۔" وہ بولا۔ "آدھے گھنٹے سے پانی پی رہے تھے۔ چلو اندر۔ اور آئندہ وقت پر کلاس میں رہا کرو۔" ماسٹر صاحب بولے۔ وہ اندر آ گیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پیریڈ کے پندرہ منٹ ضائع ہو چکے تھے۔ ماسٹر صاحب نے کتاب اٹھائی اور لیکچر دینے لگے۔ درمیان میں اور پیچھے بیٹھے ہوئے طالب علم ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ اور کچھ لیکچر سننے کی بجائے پریکٹیکل کا کام مکمل کر رہے تھے۔ ایک طالب علم کونے میں بیٹھا ہوا ناول پڑھ رہا تھا۔ جبکہ چند ایک ایسے طالب علم بھی تھے جو رات کی نیند پوری کر رہے تھے اور اُونگھ رہے تھے۔ "طارق! کیا کر رہے ہو؟ ماسٹر صاحب لیکچر دیتے ہوئے اچانک بولے۔ "جج — جی کچھ نہیں۔" طارق فوراً پریکٹیکل جرنل چھپاتے ہوئے بولا۔ ذرا اس سبق کا مرکزی خیال بتاؤ۔ "ماسٹر صاحب بولے۔ "جی! کس سبق کا؟ طارق بولا۔ حد ہو گئی۔ جو سبق میں پڑھ رہا ہوں۔" ماسٹر صاحب بولے۔ "جی — وہ۔ آپ کونسا سبق پڑھا رہے ہیں؟ طارق بوکھلا کر بولے۔ "ہوں! تو تم لیکچر سن رہے ہو۔ یہ بھی نہیں پتہ کہ میں کونسا سبق پڑھا رہا ہوں۔ ارشاد تم بتاؤ۔" ماسٹر صاحب طارق کے برابر والے لڑکے سے بولے۔ ارشاد کھڑا ہو گیا۔ "کیا بتاؤں سر۔" ارشاد بولا۔

"سبق کا نام" ماسٹر صاحب غصّے سے بولے "جی — وہ — نام ....." ارشاد ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ "تو تمہیں کبھی نہیں معلوم۔ تم دونوں کلاس سے باہر نکل جاؤ۔" ماسٹر صاحب بولے۔ وہ دونوں کلاس سے باہر چلے گئے۔ باہر نکل کر ارشاد بولا، "چلو یار، حاضری تو لگ ہی گئی ہے" "ہاں! آؤ کینٹین تک چلیں۔" طارق نے کہا اور دونوں چل دیئے۔

کلاس روم میں ماسٹر صاحب اب تیسرے

طالب علم سے پوچھ رہے تھے۔ "کیوں بھئی مراد! تمہیں بھی سبق کا نام معلوم ہے یا نہیں!" "جی معلوم ہے۔ نام ہے 'آرام و سکون' " مراد نے کہا "ہوں اور اس کا مرکزی خیال کیا ہے؟" ماسٹر صاحب بولے۔ "مرکزی خیال ــــ؟" مراد اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ "اچھا چلو بیٹھ جاؤ اور اب سب غور سے سنیں" ماسٹر صاحب نے کہا۔ مراد بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "ایک تو ان کا پیریڈ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا" ماسٹر صاحب مرکزی خیال بتا رہے تھے۔ مگر چند ایک ہی سن رہے تھے۔ ورنہ پھر وہی کچھ دوبارہ شروع ہوچکا تھا ــــ آخر وقت ختم ہوا اور گھنٹہ بجا۔ گھنٹہ بجتے ہی طالب علموں میں ایک شور سا گونجا۔ ماسٹر صاحب باہر نکل گئے اور ایک بار پھر آدھی سے زیادہ کلاس باہر نکل چکی تھی کوئی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ کوئی برآمدے میں۔ اور کوئی ماسٹر صاحب کی نقلیں اتار رہا تھا۔ اور جیسے ہی ماسٹر آتے نظر آئے سب کلاس کی طرف بھاگے ....

کم و بیش اسی طرح سارے پیریڈ گزر گئے۔ ماسٹر آتے رہے بچے حاضری لگواتے رہے۔ شور ہوتا رہا۔ اور چھٹی کی گھنٹی بجی۔ ماسٹر صاحب کے کلاس سے باہر نکلنے سے پہلے ہی بچے باہر تھے اور اسکول سے باہر نکل آئے۔ بس اسٹاپ پر طالب علموں کا ٹھٹھ موجیں مار رہا تھا۔ طلباء الٹی سیدھی بکواس میں مصروف تھے۔ ٹی وی کے ڈراموں اور فلموں پر بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے یوں لگتا تھا۔ جیسے انہیں کسی بات کی فکر ہی نہ ہو۔ زندگی ان کے نزدیک کیا تھی۔ محض مذاق! ایک پورے دن میں انہوں نے کیا کیا۔ سوائے بڑے کاموں کے۔

آخر بس آگئی اور سب اس میں گھسے اور گھستے چلے گئے۔ بس چلی اور اب بس میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ طلباء، کنڈیکٹر سے بھی لڑائی میں مصروف تھے اور ــــ اور بس چلی جا رہی تھی.......... ایسی ہی زندگی چل رہی ہے آج کے طالب علموں کی۔ صبح سے رات تک روزانہ یہی ہوتا ہے۔

عاشی اب تو چپ ہوجا

مرسلہ ــــ شمسہ شاہین شمع

پیڑ پہ کوئل بیٹھی تھی — تجھ کو سن کر اُڑ بھی گئی
چڑیا اِدھر کو آتی تھی — آتے آتے مُڑ بھی گئی
کوئی بھی موجود نہیں! — صاف ہوئی کچھ ایسی فضا
عاشی اب تو چپ ہوجا

جو سنتا ہے تیرے راگ — سر کو پکڑتا جاتا ہے
آخر چِلّا چِلّا کر — لگو پوچھتا جاتا ہے
روتی ہے کہ گاتی ہے — پہلے ہم کو یہ تو بتا
عاشی اب تو چپ ہوجا

یوں تو رونا اور گانا — سب کو آتا ہے پیاری
ہر اک روتا ہے پیاری — ہر اک گاتا ہے پیاری
لیکن جو گا سکتے ہیں — یوں نہ گا کر اُن کو رُلا
عاشی اب تو چپ ہوجا

حواسِ باختہ

یوسف نصراللہ ـــــــ کراچی

اتوار کی صبح تھی۔ گڈو، ثمینہ اور راشد اُٹھ کر ناشتے کے لیے زینے سے اُترے۔ امّی نے ان کو دیکھ کر کہا "بیٹا! مجھے تو آفس جانا ہے اور تمھارے ابّو کو بھی بینک جانا ہے، تھوڑی دیر بعد روبینہ آنٹی، احمد انکل اور اُن کا بیٹا یوسف آنے والے ہیں۔ ہماری غیر موجودگی میں تم لوگ اُن کی خاطر مدارت کرنا۔"

"تمھاری امّی نے بے حد لذیذ کھانا اس تھالی میں رکھا ہے، جب مہمان آئیں تو یہ پیش کرنا اور شرارتوں سے باز رہنا۔" ابّو نے بھی تاکید کی اور دونوں رخصت ہوگئے۔ گڈو، ثمینہ اور راشد مہمانوں کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک ایک لال بیگ ثمینہ کے قریب سے گزرا، ثمینہ نے چیخ ماری اور پاگلوں کی طرح بھاگنے لگی، بس پھر کیا تھا! وہ پھسلی اور گر پڑی۔ گڈو اس کی بے وقوفی پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ثمینہ کو بے حد غصّہ آیا اُس نے چمچہ اُٹھا کر گڈو کو مارا۔ گڈو تو ہٹ گیا اور چمچہ راشد کی ناک پر پڑا۔ اپنی ناک کی اس توہین پر وہ آگ بگولا ہوگیا اور اس نے ثمینہ پر کتاب دے ماری، لیکن وہ ثمینہ کو لگنے کے بجائے تھالی کو لگی اور سارا کھانا زمین پر گر گیا۔ تینوں خوفزدہ ہوگئے۔ اب مہمانوں کو کیا پیش کریں گے؟ وہ تینوں چھوٹے سے ہی تو تھے۔ وہ کیا پکا سکتے تھے۔ اور کھانا تو ضائع ہوچکا تھا۔

"یہ راشد کی غلطی تھی، چنانچہ اسے پھر سے آٹا گوندھ کر، سالن بنا کر مہمانوں کو پیش کرنا پڑے گا۔" ثمینہ غصّے سے بولی۔ یہ سُن کر گڈو تو مسکرایا، لیکن راشد کے تلووں سے زمین ہی نکل گئی۔ وہ تو صرف چھ سال کا تھا۔ امورِ خانہ داری سے اُسے کیا تعلق، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا اگر امّی کو خبر ہوتی کہ اس نے یہ شرارت کی ہے تو اس کی پٹائی ہو جائے گی۔ اسی لیے راشد نے سر جھکا لیا اور کہنے لگا "کیوں نہ ہم احمد انکل اور روبینہ آنٹی کے لیے آلو کے پراٹھے بنالیں؟"

"ہاں یہ کچھ آسان ہے، میں آلو کے ٹکڑے کرتی ہوں، تم ان کو پراٹھے میں ٹھونس دینا اور بس بن گئی ہماری عمدہ ترین ڈش!" ثمینہ نے خوش ہوکر تالی بجائی ان معصوم بچّوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ آلو پکائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کچّے آلو لیے ان کو سلائس کیا اور روٹی کے موٹے تو دوں میں ٹھونس کر لگے پراٹھے بنانے۔

وہاں روبینہ آنٹی اور احمد انکل یہ سوچ رہے تھے۔ "صاعقہ نے ہمارے لیے کتنا اچھا کھانا پکایا ہوگا!" انھیں کیا علم تھا کہ کچّے آلو اور آٹا ان کا منتظر تھا پھر وہ تیار ہوئے، گاڑی میں بیٹھے اور چل پڑے۔

ادھر ایک تماشا جاری تھا۔ ثمینہ نے پلیٹ اُٹھانی چاہی تو اُس کے ہاتھ سے گرم چائے کا پیالہ چھوٹ کر بلّی پر گرا۔ اس نے کچھ ایسی درد بھری آواز میں "میاؤں" کیا کہ راشد چونکا اور تیل کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے

نکل کر سیدھا گڈو کے سر پر گیا۔ گڈو کے بال دیکھ کر سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ثمینہ نے جو چولھا جلایا تو آگ ایسے نکلی کہ پردے کو بھی لگ گئی۔ اب تو مصیبت آئی! گڈو نے جلدی سے بالٹی پھینکی آگ تو بجھ گئی مگر ہر طرف پانی پھیل گیا۔ وہاں راشد نے جو آٹا گوندھنا شروع کیا تو اس کا ہاتھ ہی اس گیلے آٹے میں چپک کر رہ گیا۔ اور ثمینہ آلو کاٹتے کاٹتے انگلی کاٹ بیٹھی۔ ثمینہ نے زوردار چیخ ماری تو گڈو، جو فریج سے دودھ کی بوتل نکال رہا تھا، گھبرا گیا اور بوتل گرادی۔ اس کے فوراً بعد کھڑکی سے پڑوسی کی بلی آکر گرا ہوا دودھ چاٹنے لگی۔ یہ دیکھ کر ایک کتا بھی وہاں آگیا اور بھونکنے لگا۔ گڈو، کتا دیکھ کر ڈر گیا اور اس تیزی سے پیچھے مڑا کہ سارا آٹا راشد کی آنکھوں میں پڑ گیا اور وہ پھسل کر گر پڑا۔

اس ساری ہڑبونگ نے باورچی خانے کے نقش و نگار ہی بدل کر رکھ دیئے تھے۔ جلے ہوئے لال پیلے دودھ آلودہ زمین، آٹے سے بھرا ہوا سنک، اور تین شرارتی بچے جن کی خوب پٹائی ہونے والی تھی۔ اُوپر سے بلی بھی آگئی تھی اور کھڑکی کے باہر کتا کھڑا ہُوا تھا۔

ان سب پریشانیوں سے دوچار ہو کر وہ تینوں ذرا ستانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ اچانک گاڑی کے ہارن کی آواز آئی وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف جھپٹے تو گاڑی سے آنٹی روبینہ، یوسف اور انکل احمد کو باہر آتے دیکھا۔ اُف! پھر کیا تھا۔ ثمینہ تو بے ہوش ہونے لگی تھی گڈو نے جلدی سے بلی کو بھگایا اور زمین سے آٹا جھاڑو کے ذریعے ہٹانے لگا، لیکن دیر ہو چکی تھی! آنٹی روبینہ کچن میں داخل ہوئیں تو دودھ کے دریا میں پھسل گئیں اور گھبرا کر زور سے چیخیں، گڈو نے جلدی سے اُنھیں اُٹھایا اور انکل احمد سے ملنے باہر گیا۔ ادھر یوسف آیا تو وہ کچن کی حالتِ زار دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا۔

پھر کھانے کا وقت آیا تو گڈو نے بھالی مہمانوں کو دی۔ اس کے بعد کیا ہُوا، اس کے متعلق تاریخ خاموش ہے۔ البتہ یہ پتا ہے کہ روبینہ آنٹی اور احمد انکل کو شدید درد ہُوا پیٹ میں! اور ڈر کے مارے وہ آیتیں پڑھنے لگے۔

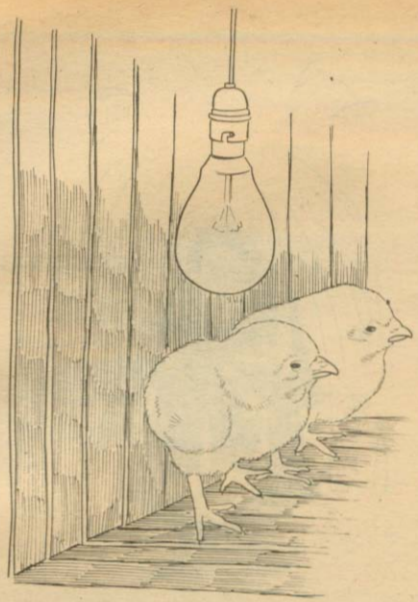

دو ننّھے چوزے

محمد ایوّب خان

پچھلا نومبر !
میں نے خریدے
دونوں بہت ہی
مُرغی بیچاری
کھائیں فلائی (Fly)
پانی پئیں نہ !
کرکے اشارہ
آگے اور پیچھے
سب بہن بھائی
ان سے کریں پیار
مجھ کو بہت تھی
تھی یہ خواہش
اِک دن جو دیکھا
کانپ رہے تھے
دِل میں یہ سوچا
سردی ہے زیادہ
یہ سوچ کر پھر
دونوں کو میں نے
سو واٹ کا بلب

یا تھا دسمبر
دو ننّھے چوزے
تھے پیارے پیارے
کے راج دُلارے
پوری کی پوری
جو تھا ضروری
جب ہم بُلائیں
وہ بھاگے آئیں
اِن کے شیدائی
اللہ دُھائی
اِن سے محبّت
دُوں اِن کو راحت
دونوں بیچارے
سردی کے مارے
مَر ہی نہ جائیں
ان کو بچائیں
اِک ڈبہ لا کر !
اس میں بٹھا کر
ڈبّے کے اندر

میں نے جلایا
تھا شام کا وقت
صبح کو اُٹھ کر
گرمی کی شدّت
اللہ کو دونوں !
سب بہن بھائی
دِل میں نہ جانے
غلطی پہ اپنی !
ایسے کھڑا تھا
ابّو نے دیکھا
بے عقل کہہ کر
سچ پیارے بچّو !
امّی یا ابّو !

کچھ اُن کے اوپر
خود سو گیا پھر
دیکھا جو جا کر
سے وہ بیچارے
تھے وہ پیارے
گُم سُم کھڑے تھے
کیا کہہ رہے تھے
میں سخت نادم
جیسے ہوں ملزم
تو مجھ کو مارا !
سب نے پکارا
جو کام بھی ہو
سے مشورہ لو

اوٹ پٹانگ

اخلاق احمد ، مانسہرہ

آج جب قلم ہاتھ میں لیا تو سوچا کچھ لکھوں مگر پھر یہ خیال بھی ذہن سے چپٹ ، ارے نہیں چمٹ ... شاید یہ بھی نہیں ... چپک ... ارے جو بھی ہو آپ خود ہی سمجھ لیجئے گا۔ ...

ہاں میں کہہ رہا تھا کہ یہ خیال ذہن سے ... کر رہ گیا ... کہ لکھوں تو کیا اور کس چیز کے متعلق ویسے لکھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایسے ایسے طریقے کہ آپ حیرت سے دنگ رہ جائیں ویسے حیرت سے دنگ رہ جانا بھی صحت کے لئے کبھی کبھار اچھا ہوتا ہے اسی طرح صحت کو بھی ٹھیک رکھنے کے لئے طرح طرح کے کام کرنے پڑتے ہیں آپ جب بیمار ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں ؟ ویسے بیمار ہونا بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے ارے شاید میں کچھ غلط کہہ گیا چلیے پھر اس طرح سہی۔

"بیمار ہونا بھی ایک لحاظ سے بُرا ہے" مگر نہیں بُرا تو یہ تب ہوتا، جب آدمی خود بخود بیمار ہوتا لیکن آدمی خود بخود تو کبھی بیمار ہوتا ہی نہیں اچھا یوں سمجھ لیجئے کہ انسان کا بیمار ہونا اور صحت مند ہونا خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہاتھ میں ہونا تو میں نے اس طرح کہہ دیا، جیسے ہاتھ میں کوئی مزیدار سی چیز ہو۔ ویسے آپ کوئی سی چیز بھی ہاتھ میں لے سکتے ہیں، مثلاً آلو، گوبھی، پیاز، ٹماٹر، مٹر

.... ارے ارے، یہ تو میں سبزیوں کے نام لکھنے بیٹھ گیا۔ ویسے سبزیاں کھانا بھی ایک طرح کا مشغلہ ہے۔ ہائیں، آج کیسی کیسی باتیں ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اب یہی دیکھئے، یہ تو اس طرح ہونا چاہیے تھا آج کیسی اچھی باتیں منہ سے نکل رہی ہیں۔ لیکن نہیں، شاید پہلے والا جملہ ہی درست تھا کیونکہ میں منہ سے نہیں، بلکہ ہاتھ سے لکھ رہا ہوں ارے ہاں بات ہو رہی تھی، سبزیوں کی لیکن میرے خیال میں آپ خود ہی وہ جملہ سمجھ گئے ہوں گے اب آپ میری طرح وہ تو نہیں ہیں یہ دو الفاظ بھی انتہائی کام کے ہیں یعنی "وہ تو" آپ اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ "دنیا میں کوئی چیز میری طرح نہیں ہے" ہائیں، یہ میں نے کیا لکھ دیا۔ غضب خدا کا، آج تو ذہن بالکل کام ہی نہیں کر رہا ویسے ذہن کا

کام نہ کرنا بھی انتہائی خطرناک بات ہے اب آپ پوچھیں گے کہ وہ کیسے؟ لیکن اس کا جواب بھی آپ خود ہی دیں گے، میں تو نہیں دوں گا۔

اگر آپ یہی جملہ اپنے ٹیچرز کو کہہ دیں تو کیسی رہے گی یقیناً وہ .... آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔!

لیکن میرے بہت سے چھوٹے بھائی اب یہ سوچ رہے ہوں گے، "یقیناً وہ" کے آگے یہ نقطے کیسے؟ ویسے کبھی کبھار سوچنا بھی اچھا ہوتا ہے مگر.... یہ سوال خود میرے ذہن میں بھی چکرا رہا ہے کہ وہ "کیسے"؟

وہ اس طرح کہ جب آپ حساب کا کوئی سوال .... ارے باپ رے، یہ حساب کہاں سے نکل آیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ ساتھیو! کہ میں حساب سے اس بُری طرح الرجک ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔

راز کی بات ہے کہ میں خود "الرجک" کے معنی نہیں جانتا میں اپنے استادِ محترم سے پوچھ کر آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ ارے شاید آپ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ہاں میں بھی غلطی پر تھا اگر مجھے نہیں معلوم تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کو بھی معلوم نہ ہو۔

میری تو یہ معمولی سی غلطی ہے مگر کچھ لوگ تو اتنی بڑی غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ کہ .... اب میں کیا بتاؤں۔ آپ خود ہی جانتے ہیں ویسے غلطی کرنا بھی اچھی ہی بات ہے اگر بچپن میں کی جائے۔

ارے بھئی میں غلطی کی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی بات کر رہا ہوں لیکن آپ تو مجھ سے کئی گنا زیادہ ذہین ہیں اور ہمیں تو شاید ذہانت چھو کر بھی نہیں گزری۔ مگر آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ ذہانت کسی کو چھوتی ہے یا میری طرح ہر ایک .....!

ہم تو شاید شروع ہی سے بیوقوف قسم کے ہیں۔ ویسے بیوقوف بننا بھی اتنا بُرا تو نہیں اس لئے آپ بھی کبھی کبھار بیوقوف بن جانا جایا کیجئے فائدے میں رہیں گے۔ اب آپ یقیناً مجھ سے بور ہو رہے ہوں گے۔ ویسے بور ہونا بھی آپ کے لئے اچھا .....! ارے چھوڑیئے بھی، بات ہوتے ہوتے اور زیادہ اونٹ کی گردن کی طرح لمبی ہو جائے گی اور آپ پہلے ہی بور ہو رہے ہیں۔ آپ سے باتیں کرنے کو تو بہت جی چاہتا ہے مگر "ہائے رے مجبوری" وقت ہوتا تو اس کے متعلق بھی تفصیل سے بتاتا اچھا اگر زندگی رہی تو پھر کبھی اس کے متعلق بات ہو گی۔

پاکستانی بچے

مرسلہ ——— ممتاز احمد قریشی

آنکھ کا تارا پاکستان .. چاند سے پیارا پاکستان
ہم دھرتی کے رکھوالے پاک وطن کے متوالے
اس کی شان بڑھاتے جائیں اپنی آن بڑھاتے جائیں
ہر دم اچھے کام کریں گے قوم کا روشن نام کریں گے
حق کی خاطر جان لڑائیں سب کو اپنی شان دکھائیں
دُنیا سے باطل کو مٹائیں نیک بنیں اور نیک بنائیں
ہم ہیں پاکستانی بچے
روشن دل نورانی بچے

جیالا گدھا

عظمیٰ حیدر ——— فیصل آباد

ایک آدمی کے پاس ایک گدھا تھا اور ایک اُونٹ وہ روز اُن پر نمک کی بوریاں لاد کر شہر لے جاتا تھا۔ مالک دونوں جانوروں سے خوب کام لیتا تھا۔ ان کو مارتا پیٹتا تھا۔ اور کھانے کو بھی کم دیتا تھا۔ وہ دونوں اُس سے عاجز آچکے تھے۔ ایک دِن انھوں نے تنگ آکر وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا اور آپس میں ایک ترکیب طے کی۔

دوسرے روز جب ان کا مالک بوجھ لاد کر شہر جا رہا تھا تو درّے کے قریب جا کر دونوں جانور ایسے لیٹ گئے جیسے بے حد تھک چکے ہوں۔ مالک نے ڈانٹا ڈپٹا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجبوراً مالک کو ڈنڈے سے کام لینا پڑا۔ پہلے بے چارے اُونٹ کی باری آئی۔ مالک نے ڈنڈے مارنے شروع کیے ابھی چالیس بھی نہ ہو پائے تھے کہ اُونٹ درد سے بلبلا اُٹھا اور فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ مالک نے گدھے کو ڈنڈے مارے۔ چالیس، پچاس اور پھر ساٹھ، لیکن گدھا ہمّت کر کے بیٹھا رہا۔ مالک تھک گیا اور اُس نے سوچا سچ مچ اس کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دَم توڑ رہا ہے۔ اُسے بہت افسوس ہوا۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس نے گدھے والی بوریاں اُٹھا کر اونٹ پر لاد دیں اور اُسے ہانکتا ہوا آگے چلا۔ اُونٹ دوگنا بوجھ اُٹھائے چلا جا رہا تھا اور دل ہی دِل میں گدھے پر لعنت بھیج رہا تھا۔

گدھا اُسی طرح ہلے جُلے بغیر پڑا رہا۔ لیکن جونہی مالک اور اُونٹ نے موڑ کاٹا، وہ اُٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گدھا تین دِن اور تین راتیں مسلسل بھاگتا رہا۔ چوتھے روز وہ ایک حسین چراگاہ اور تیز رو دریا تک پہنچا۔ اُسے وہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ وہیں رہنے لگا۔

اُس علاقے پر برسوں سے ایک شیر کا راج تھا۔ ایک دِن شیر نے سوچا کیوں نا، اپنے علاقے کا دورہ کیا جائے۔ وہ صبح سویرے اپنے ٹھکانے سے نکلا اور دوپہر کو اس

جگہ پہنچا، جہاں گدھا اپنی دُم سے مکھیاں اُڑاتا چرتا پھر رہا تھا۔ گدھے کو دیکھ کر شیر بہت حیران ہوا کہ یہ کون سی مخلوق ہے۔ اسے تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

گدھے کی نظر شیر پر پڑی تو وہ ڈر گیا۔ اُس نے سوچا موت آگئی، لیکن اُس نے ہمّت نہ ہاری اور اپنی دُم اُونچی اُٹھائی۔ کان کھڑے کیے اور باآوازِ بلند چیخنے لگا۔ گدھے کی چیخ سُن کر شیر کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ شیر بھاگا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں بھیڑیا مل گیا۔ اُس نے حیران ہو کر شیر سے پوچھا "حضور آپ کس سے اتنے ڈر گئے۔؟"

شیر نے جواب دِیا "میں نے ایک جانور دیکھا ہے، جو بے حد ہیبت ناک ہے۔ کانوں کی جگہ پَر لگے ہیں۔ منہ سر سے بھی چوڑا ہے۔ گرجتا ہے تو زمین ہِل جاتی ہے۔ اور آسمان دھندلا پڑ جاتا ہے۔"

بھیڑیا بولا "کہیں آپ گدھے کی بات تو نہیں کر رہے۔ آیئے میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر بھیڑیا کہیں سے رسّی لے آیا اُس نے ایک سرا شیر کی اور دوسرا اپنی گردن سے باندھا اور دونوں گدھے کے پاس پہنچے۔ شیر کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ گدھا بھی ڈر گیا، لیکن پھر اُس نے وہی پُرانا تجربہ آزمایا اور لگا ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے شیر پھر ڈر گیا اور پیچھے کی طرف بھاگا۔ پیچھے مُڑتے وقت اُس نے رسّی کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ بھیڑیئے کا سر تن سے جُدا ہو گیا۔ جو دوسرے کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی اُس میں گرتا ہے، یہی حال بھیڑیے کا ہوا۔

شیر اپنے گھر پہنچا تو کوّا اُس کے پاس آیا اور پوچھا کیا بات ہے؟ شیر نے اُسے بتایا کہ ایک جانور ہماری چراگاہ میں گھُس گیا ہے۔ کوّے کو اس نئے جانور کو دیکھنے کا تجسّس ہوا۔ وہ وہاں پہنچا، جہاں کا پتہ اُسے شیر نے بتایا تھا۔

گدھے نے کوّے کو دُور سے ہی آتے دیکھ لیا اور وہ ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ کوّا قریب پہنچا اُس نے گدھے کو بے جان پڑے دیکھا تو اُس نے کہا: "میں شیر سے ابھی جا کر کہتا ہوں میں نے اُس نئے جانور کو مار دیا۔" وہ خوشی سے پھُولا نہ سمایا وہ گدھے کے اُوپر اُترا اور بے فکری سے چلنے پھرنے لگا اچانک اُس نے دیکھا کہ اناج کا دانہ زمین پر پڑا ہے۔ اُس نے جھُک کر اُٹھانا چاہا تو اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اور گدھے کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ گِر پڑا۔ گدھا فوراً اُٹھا اور اُسے اتنا مارا کہ اُس کے سر کے بال جھڑ گئے۔ وہ شیر کے پاس پہنچ کر بولا "اس جانور نے تو میرا کچومر نکال دیا ہے۔ اس نے مجھے مار مار اپاہج کر کے رکھ دیا۔ کہیں یہ حال آپ کا بھی نہ ہو۔" شیر نے یہ سُنا تو وہاں سے ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اور بھولا گدھا اب تک وہاں رہتا ہے اور خوش و خرّم ہے۔

قلمی دوستی

آؤ ملائیں ہاتھ

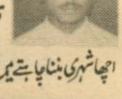

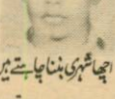

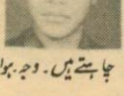

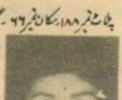

الیاس یوسف ۱۸ سال
جماعت فرسٹ ائیر۔ کرکٹ کھیلنا
قلمی دوستی۔ مضمون، انگلش
اچھا شہری بننا چاہتے ہیں، وجہ، غریبوں کی مدد
پلاٹ نمبر ۱۸۸، مکان نمبر ۶۶ ۔ گلی نمبر ۱۔ غریب آباد ۔ حیدرآباد

محمد انور سیال ۱۵ سال
جماعت نہم ۔ قلمی دوستی
مطالعہ۔ مضمون اسلامیات
اچھا شہری بننا چاہتے ہیں۔ وجہ قلمی شوق اور غریبوں کی مدد
چاہ سیالاں ۴، ۵۔ تحصیل ننکانہ صاحب۔ پوسٹ کوڈ ۳۹۱۸۱

محمد جنید ہارون ۱۱ سال
جماعت ششم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون ریاضی ۔ انجینئر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ہوائی جہاز بنانے کا شوق ہے۔
مکان ۱۸/۱۲۰۔ج/۵/ج حسینی منزل، پہلی منزل، جیلانی روڈ سکھر

شیخ علی عمران ۱۷ سال
جماعت ہشتم ۔ کتابیں جمع کرنا اور
نعت خوانی ۔ اُردو، سندھی ۔
فوجی بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ والد صاحب فوجی تھے ۔
معرفت عبدالغفار سیکرٹری اور نگی ٹاؤن ۔ قذافی چوک ۔ کراچی ۴۱

عامر نذیر احمد ۱۳ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
آنکھ مچولی پڑھنا، مضمون سائنس
جاسوس بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی خدمت
کوچہ سید دلاور حسین شاہ ۔ کوٹ بدر دین ۔ قصور

سید ذوالفقار علی شاہ ۱۲ سال
جماعت ششم ۔ رسائل پڑھنا
مضمون انگلش ۔ فوجی آفیسر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی حفاظت
گلی نمبر ۵ ۔ سادات منزل ۔ خالد بن ولید روڈ ۔ بہار کالونی ۔ کونڈ گودام کراچی

خرم شہزاد ۱۱ سال
جماعت ہفتم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون حساب، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے
۸۱/۳۸۳ ۔ گلبرگ III ۔ لاہور

ملک شاہد سلیم ۱۵ سال
جماعت دہم ۔ ٹکٹ جمع کرنا
مضمون حساب، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کا مفت علاج
مکان نمبر ۱۳۱۲ سیکٹر ۱-۱۰/۲ ۔ اسلام آباد

ذوالقرنین ۱۷ سال
جماعت میٹرک ۔ لوگوں میں
دلچسپی لینا ۔ فزکس، بائیالوجی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ انسانی محبت
کوڈ نمبر ۶۳۱۰۱ ۔ بندرہ ۔ بہاولپور

سید حسن رضا ۱۳ سال
جماعت نہم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ لوگوں کی خدمت ۔
بمقام و ڈاکخانہ سید انوالہ ۔ ضلع جہلم ۔ تحصیل پنڈ دادن خان

محمد صغیر ۱۷ سال
جماعت دہم ۔ کرکٹ ۔ آنکھ مچولی
مضمون حساب، پائیلٹ بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ وطن کی حفاظت
فلیٹ لال شہباز نگر ۱۵۴ ۔ این بلاک ۔ دستگیر نمبر ۹ ۔ کراچی ۳۸

نعیم احمد ۱۵ سال
جماعت دہم ۔ مطالعہ کرنا
مضمون اُردو ۔ سیکرٹ ایجنٹ
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
مکان نمبر ۲۶۵ ۔ عثمانیہ کالونی ۔ ناظم آباد نمبر ۱ ۔ کراچی نمبر ۱۸ ۔

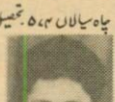

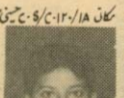

جاوید حسین کورائی ۱۶ سال
جماعت دہم ۔ ادبی کتابیں
پڑھنا ۔ مضمون ۔ ریاضی
انجینئر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غربت ہے ۔
معرفت سندھ بک ڈپو ۔ شاہی بازار ۔ پنو عاقل

فرخ شمس ۱۴ سال
جماعت نہم ۔ مفید کتابوں کا
مطالعہ کرنا ۔ مضمون ۔ اُردو
فوجی بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ سرحدوں کا دفاع ۔
۳۶/c ۔ قاسم پور کالونی ۔ ممتاز آباد ۔ ملتان

اقتدار عالم ۱۲ سال
جماعت ہفتم ۔ فٹبال کھیلنا
مضمون ۔ انگلش ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کی خدمت
معرفت افتخار کتاب گھر ۔ راجن پور ۔ وارڈ نمبر ۹

صفدر رضا ۱۶ سال
جماعت دہم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، مطالعہ پاکستان
بزنس مین بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ خصوصی لگاؤ ہے
۱/۱۲ ۔ ۱۶۲۵ ۔ ۶ ۔ اصغر مال روڈ ۔ راولپنڈی

عدنان ۱۴ سال
جماعت فرسٹ ایئر ۔ قلمی دوستی
مضمون ۔ ریاضی ۔ انجینئر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ریاضی اچھی لگتی ہے ۔
۵۵/c ۔ میر فضل ٹاؤن ۔ یونٹ نمبر ۹ ۔ لطیف آباد ۔ حیدرآباد

عبدالرحیم حیدری ۱۵ سال
جماعت نہم ۔ قلمی دوستی
مضمون ، حساب ، ٹیچر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک سے جہالت دور کرنا
معرفت عبدالکریم بک ڈپو ۔ ڈہرکی ۔ ضلع سکھر

گل شیر علی سنی ۱۷ سال
جماعت فرسٹ ایئر ۔ اداکاری
اور تقریر کرنا ۔ مضمون انگلش
پروفیسر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ تعلیم کا فروغ
شاہین کالونی ۔ باڑہ گیٹ ۔ پشاور صدر

محمد حماد ۱۲ سال
جماعت ششم ۔ کہانیاں پڑھنا
مضمون ۔ ریاضی ۔ پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
معرفت الفاروق کریانہ اسٹور ۔ شاہی بازار ۔ کنری

وقاص عزیز ۸ سال
جماعت چہارم ۔ ٹکٹیں جمع
کرنا ۔ مضمون ۔ انگلش ۔ فوجی
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
معرفت شیخ محمد اسلم ۔ مکان نمبر ۱۹۲ ۔ B ۔ پیپلز کالونی نمبر ۱ ۔ فیصل آباد

شعیب خان ۱۱ سال
جماعت ہشتم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، حساب ، پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
۱۹ ۔ A ۔ الفلاح سوسائٹی ۔ شاہ فیصل کالونی ۔ کراچی ۲۵

رانا ساجد نواز ۱۷ سال
جماعت دہم ۔ کتابیں پڑھنا
مضمون ۔ انگریزی ۔ ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ دکھی انسانیت کی خدمت
ساجد منزل ۔ علوی پارک ۔ جھمرہ روڈ ۔ جڑانوالہ ۔ ضلع فیصل آباد

عابد حسین چانڈیہ ۱۷ سال
جماعت فرسٹ ایئر ۔ قلمی دوستی
مضمون ، اُردو ۔ وزیراعظم
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ دنیا کا امیر ترین آدمی بننے کی خواہش
پوسٹ بکس نمبر ۱۸ ۔ ڈیرہ غازی خان

پرمانند کمار ۱۵ سال
جماعت ہفتم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ۔ اُردو ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ قوم کی خدمت ۔
جانکی رام شیوک رام ۔ مچھلی مارکیٹ ۔ پنو عاقل

عامر ظہیر ۱۱ سال
جماعت ششم ۔ کتب بینی
سیر و تفریح ۔ مضمون ۔ انگریزی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ انسانوں کی خدمت
B-۷ ۔ ۳۳۶ ۔ او آر کوارٹرز ۔ ایبی سینیا لائنز ۔ کراچی ۳

عبدالقدوس ۱۳ سال
جماعت چہارم ۔ تلاوتِ قرآن
مضمون ، دینیات ۔ ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
معرفت محمود ولد ابراہیم دکاندار ۔ جیوانی (مکران)

نازالیس نظیر سندھی ۱۵ سال
جماعت نہم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ، سائنس ۔ کرکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ آرزو ہے ۔
معرفت پرنس سائیکل ورکس ۔ رکیس بنجھارو روڈ ۔ کندھ کوٹ

محمد جاوید ۱۴ سال
جماعت نہم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون ۔ انگریزی ۔ انجینئر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ پسند ہے ۔
۲۵۵/۷ ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی نمبر ۱۹

عاصم ظفر صدیقی ۱۶ سال
جماعت دہم ، کرکٹ کھیلنا
قلمی دوستی ۔ مضمون ، سندھی
کمپیوٹر انجینئر بننا چاہتے ہیں ۔ معلومات حاصل کرنا ۔
نزد پوسٹ آفس جنگ شاہی ۔ ضلع ٹھٹھہ (سندھ)

ظہور احمد ۱۲ سال — گلزار احمد ۱۵ سال — سہیل شہزاد ۱۷ سال

جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا — جماعت نہم، کتابیں پڑھنا — جماعت دہم، پڑھنا

مضمون، سائنس، ڈاکٹر بننا — مضمون، اسلامیات، ٹیچر — مضمون، حساب، فزکس

چاہتے ہیں۔ وجہ، غریبوں کا مفت علاج بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے۔ پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ والد صاحب کی آرزو ہے

اندرون قلعہ روپا سنگھ۔ گلی نمبر ۲ مکان نمبر ۳۶۳۔ چونیاں۔ ضلع قصور ۲/۱۲/۵۸۔ چاندنی چوک پاپوش نگر۔ کراچی۔ ۱۸ ۱۴۔ C.R.O.G۔ کالونی۔ حیدرآباد

محمد یحییٰ ۱۵ سال — عادل گوندل ۱۴ سال — زبیر مختار ۱۳ سال

جماعت نہم، گانا گانا — جماعت نہم، ٹکٹیں جمع کرنا — جماعت نہم۔ قلمی دوستی

مضمون، حساب، انگلش — مضمون، انگریزی۔ عربی — مضمون، اردو، بائیالوجی

گلوکار بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ گانے بہت پسند ہیں پائیلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ راشد منہاس سے متاثر ہیں انجینئر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے۔

۵/۴۹۔ ۵۔ میر توسیعی کالونی۔ کھوکھرا پار۔ کراچی۔ ۳۷ ۲/۱۱۹۱۔ عزیز آباد۔ نزد جوہر آباد پولیس اسٹیشن۔ کراچی ۳۸ باہوٹ نگراں یک اسٹال مین روڈ۔ پسنی (مکران)

قدیر احمد ۱۲ سال — خالد محمود مغل ۱۳ سال — راشد محبوب ۱۲ سال

جماعت پنجم۔ آنکھ مچولی پڑھنا — جماعت پنجم۔ قلمی دوستی — جماعت ہشتم۔ ہاکی کھیلنا

مضمون، دینیات۔ ڈاکٹر بننا — مضمون۔ اردو۔ کرکٹر بننا — مضمون۔ حساب۔ ڈاکٹر بننا

چاہتے ہیں۔ وجہ۔ لوگوں کی خدمت۔ مکان ۶۹ چاہتے ہیں۔ وجہ۔ کرکٹ پسند ہے۔ پی۔ او عثمان چاہتے ہیں۔ وجہ قوم کی خدمت۔

گلی نمبر ۵۔ وائی بلاک۔ مدینہ ٹاؤن۔ فیصل آباد شاہ پیری تحصیل ٹنڈو الہ یار۔ ضلع حیدرآباد (سندھ) محلہ امام صاحب پسرور

نذیر شاہد ۱۲ سال — محمد مسلم ۱۳ سال — محمد اختر کوبر ۱۴ سال

جماعت نہم۔ رسائل پڑھنا — جماعت ہفتم۔ کرکٹ کھیلنا — جماعت نہم۔ دینی کتب پڑھنا

مضمون بائیالوجی۔ کرکٹر — مضمون انگلش۔ ڈاکٹر بننا — مضمون اسلامیات۔ ٹیچر بننا

بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے مکان نمبر ۱۵/۲ چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک و قوم کی خدمت VIII چاہتے ہیں۔ تاکہ ملک سے جہالت دور ہو۔

ای جناح روڈ۔ منظور کالونی۔ کراچی۔ ۴۴ سی اے/۱۵ پنجاب گیول کالونی گذری روڈ کراچی ۶ گوٹھ رائیس کامل کو بھر۔ صادق آباد

- قلمی دوستی کے اس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔

نام ________ عمر ________ جماعت ________

مشاغل ________ اسکول میں پسندیدہ مضمون ________

بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ ________ وجہ ________

پتہ ________

شانی ایوب

امّی ابّو کا صفحہ

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرتی اور خاندانی نظام میں لڑکوں کو لڑکیوں سے کہیں زیادہ اہمیت، رعایت اور اعتبار حاصل ہے۔ ہمارے ہاں خاندان کی عزّت و وقار، نام و نمود اور استحکام کے تمام تصوّرات لڑکوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ اگر کچھ وابستہ ہے تو صرف بوجھ کا تصوّر۔

عام طور پر ہمارے ہاں لڑکیوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویّے کا مظاہرہ اُن کی پیدائش سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ لڑکے کی پیدائش پر والدین اور خاص طور پر بڑی بوڑھیوں کے چہرے فرطِ مسرّت سے کھل اُٹھتے ہیں جسبِ استطاعت بلکہ استطاعت سے زیادہ مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس لڑکی کی پیدائش پر چہروں سے افسوس ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ یا پھر اگر خوشی منائی بھی جاتی ہے تو نہایت بے دلی اور روکھے پن کے ساتھ۔ محض دکھاوے کے لیے۔

تعلیم و تربیت اور عام گھریلو معاملات میں بھی لڑکیوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے ہمارے ہاں ایسے بے شمار گھر ہیں جہاں لڑکیوں کو واجبی تعلیم دلانے کے بعد گھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے گھریلو نوعیت کے کھیلوں، عام معاشرتی میل جول حتیٰ کہ ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ ملنے جُلنے کو بھی بعض والدین پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہاں تک کہ کھانے پینے کے معاملات میں بھی لڑکیاں والدین کی پسند و ناپسند سے لڑکوں کی طرح آزاد نہیں ہوتیں۔ عام طور پر مختلف گھریلو معاملات کے سلسلے میں لڑکیوں کی رائے لینا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اس عام معاشرتی سلوک کے باعث لڑکیوں کو ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے وہ مواقع حاصل نہیں ہو پاتے جن کی وہ، مذہبی، اخلاقی اور انسانی تعلیمات کے حوالے سے بجا طور پر حق دار ہوتی ہیں۔

اس معاشرتی رویّے کے نتیجے میں لڑکیاں گھٹن، احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ اُن کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے اور اُن میں اُس اعتماد کا فقدان ہو جاتا ہے جو ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اِن گزارشات سے ہماری مُراد ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ والدین لڑکیوں کو کھلی چھٹی دے دیں۔ ہماری گزارش صرف یہ ہے کہ والدین لڑکیوں کے ساتھ اسی شفقت، محبت، خلوص اور کھلے دل سے پیش آئیں جس سے وہ لڑکوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ خُدا اور اس کے رسُولؐ کا حکم بھی یہی ہے۔

پاکیزہ ، صحت بخش ، لذیذ
احمد کے کھانے سب کو عزیز
آپ سفر میں ہوں ، ملک سے باہر ہوں یا
گھر میں اچانک مہمان آجائیں
احمد کے پکے پکائے کھانوں کے
ڈبوں کو صرف دس منٹ
گرم پانی میں رکھیں یا کھول کر گرم
کرلیں ۔ لیجئے کھانا تیار
لذّت بھی ۔ کفایت بھی
احمد کے پکے پکائے
کھانے
نہاری ، شاہی حلیم ، قورمہ ، کوفتہ
آلو قیمہ ، سرسوں کا ساگ
جدید ترین آٹومیٹک پلانٹ پر تیار کردہ
ہر دم تازہ ، سیل بند ڈبوں میں
دنیا میں ہر جگہ دستیاب
AHMED'S
NIHARI
احمد
ہمیں فخر ہے کہ ہماری مصنوعات
نے ساری دنیا میں پاکستانی ذائقوں
کو متعارف کرایا ۔

MASS

منشیات کی آگ

آپ کو اپنے ہاتھوں جلا دیتی ہے!

منشیات کی لعنت اِس آگ کی مانند ہے جو آپ کو اور آپ کے خاندان کو آپ کے ہاتھوں جھلسا دیتی ہے۔ اس کا انجام صرف ذِلت، بدنامی اور نامرادی کی سلگتی ہوئی راکھ ہے۔ اپنی زندگیوں کو نذرِ آتش نہ کیجیے۔

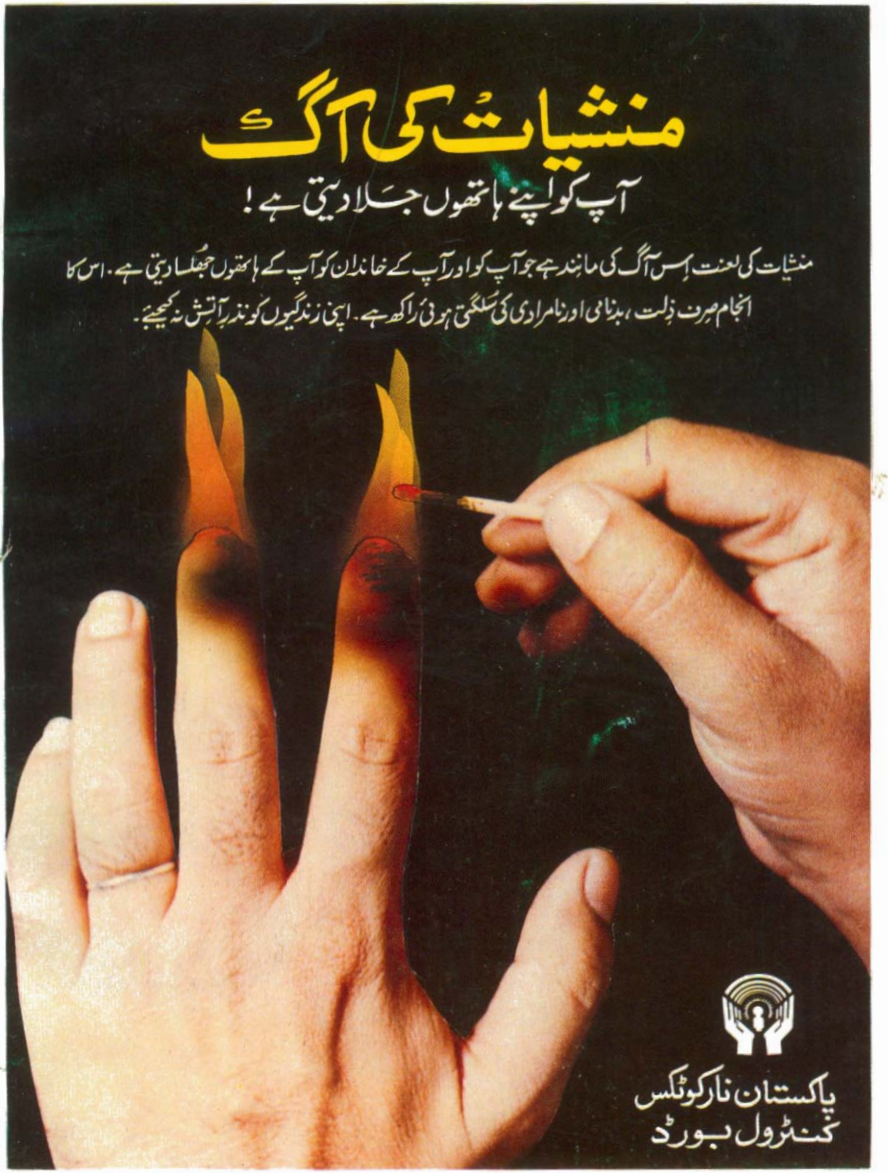

پاکستان نارکوٹکس
کنٹرول بورڈ